محاسنِ سجّاد

مرتبہ

مسعود عالم ندوی

سلسلہ مطبوعات الہلال بک ایجنسی (۱)

محاسنِ سجادؒ

یعنی حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ کی سیرت اور خدمات سے متعلق
چند مضامین کا مجموعہ

مرتبہ

مسعود عالم ندوی

پیش لفظ

از

جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ

حیدرآباد بک ڈپو حیدرآباد دکن
فی جلد ایک روپیہ (عمر) علاوہ محصول ڈاک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

خدمات

تاثرات

پیش لفظ

بہار کی سرزمین آج سے نہیں، گوتم بدھ کے وقت سے پُرُبہا چلی آرہی ہے۔ کیسے کیسے عالم، درویش، حکیم، ادیب، مقنن، مورخ، شاعر، اِسی خاک سے اُٹھے، اسی خاک میں ملے، اور کتنے ماشاء اللہ آج بھی وہی شمع قدیم روشن کئے ہوئے، اپنے وطن کو مطلعِ انوار بنائے ہوئے ہیں۔ انہیں کی صف میں آکر آخر میں صاحبِ محاسن ابوالمحاسن سجاد ملے۔ اگلوں نے تعظیم دی، پچھلوں نے تکریم کی، اور اب جو دیکھا تو ان کے قدم کسی سے پیچھے نہیں۔ منزلت کے دربار میں اُنکی کرسی کسی سے نیچے نہیں —— امتیاز ناقصوں میں نہیں کاملوں میں پایا۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ ——
چمک جگنو کی نہیں جو ہر اندھیرے گھوپ میں روشنی پیدا کرسکتی ہے۔ نورِ ماہتاب کا، جو جگمگاتے ستاروں کو ماند کردیتا ہے۔

صاحبِ سیرت کے جو حالات تھے اور کمالات، ان کی تفصیل تو اگلے اوراق ہی سے معلوم ہوگی۔ دوستوں، رفیقوں، شاگردوں نے انہیں جس

جس نظر سے دیکھا، وہی وہ آپ کو بھی دکھا رہے ہیں۔ مجھ گمنام و گوشہ نشین کا تعلق تو بس دُور سے ایک تماشائی کا سا رہا، اور خوش ہوں کہ وہی خفیف سا تعلق بھی اس وقت کام آ رہا ہے ——— یہ چند الفاظ لکھنے کی خدمت لکھنے والے کے لئے مایۂ سعادت ہے اور ذریعۂ عزت افزائی!——

جلسوں اور قومی اجتماعات کے موقع پر یکجائی کا اتفاق دو چار بار ہوا۔ دل قائل ان کے اخلاص کا رہا۔ دماغ نے کلمہ اُن کی معاملہ فہمی و تدبر کا پڑھا، آنکھ نے احترام ان کی سیرت و شخصیت کا کیا!

گلدستہ میں پھول رنگ رنگ کے ہوتے ہیں، اور چمن میں غنچہ طرح طرح سے مسکراتے ہیں، کوئی عام پسند کوئی خاص پسند۔ کسی کی خوشبو تیز کسی کا رنگ دلاویز۔ کسی کی صورت دل لبھانے والی، کسی کی نزاکت نظر میں اُتر جانے والی۔ اس گلدستہ یادگار میں بھی انتخاب مضامین اپنی پسند سے کیجئے۔ اس ہیچمدان کوتاہ نظر کو تو اپنے ذوق سے قریب تر، عنوانات ذیل نظر آئے:-

'مضمون مولانا محمد منظور صاحب نعمانی' ص ۱۰

'تذکرات مولانا سید سلیمان صاحب ندوی' ص ۷

'مقالہ مولانا مسعود عالم ندوی' ص ۱۱

سارے مجموعہ میں ایک مضمون عجیب سا نظر آیا۔ وصل میں فصل کا نقشہ!
بزم میں رزم کا جلوہ! قلم کی گردش میں شمشیر کی بُرش کا تماشا! ——— اور پھر
اس مضمون کا جواب اسی انداز میں! وہی ردیف وہی قافیہ، وہی رجز خوانی
وہی دم داعیہ! ——— مجھ غریب کو کیا خبر تھی کہ،

اب عظیم آباد بھی پنجاب ہے

میں تو اپنی بھولے گی سے یہ سمجھے ہوئے تھا کہ پانی پت پٹنہ سے دُور بہت دور ہے۔
بہرحال یہ کتاب المناقب اس باب الجدل کے باوجود بھی ہے پڑھنے کے
قابل۔ مولانا سجاد علیہ الرحمۃ کی ذات وقت کی بہت مغتنم ہستیوں میں تھی،
علماً بھی، عملاً بھی۔ فکر و نظر کی رسائیوں کے لحاظ سے بھی، اخلاص و ایثار کی گہرائیوں
کے لحاظ سے بھی، اللہ تبارک و تعالیٰ بال بال ان کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کی خوبیوں
میں ان کے نقش قدم پر ہم سب کو چلائے۔ قابل تبریک و تہنیت ہیں مولانا مسعود عالم ندوی
کہ ان کی کوششوں سے اردو میں یہ پاکیزہ سیرت مرتب ہو گئی۔

عبدالماجد

دریاباد۔ ۱۷ اپریل ۱۹۴۱ء

تقریب

(۱)

سُنا کرتا تھا "عرفت ربی بفسخ العزائم"، محاسنِ سجاد کے سلسلہ میں ایک بار پھر اس کی تصدیق ہو گئی، جو مجموعہ جنوری میں شائع ہو رہا تھا، اس کی آخری سطریں آج ۲۳ر اپریل کو لکھی جا رہی ہیں۔ دوستوں نے اس مجموعہ کی ترتیب میرے ذمہ کی، اور پھر 'تقریب' لکھنے کا بھی حکم ہے! حیران ہوں، کیا لکھوں؟ مجموعہ کے لئے (مولانا کی یادیں) لکھنے بیٹھا، تو کچھ لکھ نہ سکا، سچی بات یہ ہے کہ قلم جذبات کا ساتھ نہ دے سکا، کچھ رفاقت کی، تو آنسوؤں نے! لیکن آپ جانتے ہیں کہ لکھنے پڑھنے کے معاملہ میں آنسوؤں کی رفاقت کام نہیں دیتی۔ اب 'تقریب' لکھنے بیٹھا ہوں تو پانچ مہینوں کے بعد پھر دل کی گہرائیوں سے ہوک سی اُٹھتی معلوم ہوتی ہے۔ آگے پیچھے نظر ڈالتا ہوں تو مولانا محمد علی مرحوم کا یہ عرفانی شعر زبان پر آتا ہے، ؎

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

بہر حال جس طرح بھی بن پڑے، الٹی سیدھی دو چار سطریں لکھتا ہی ہیں، ورنہ اس مجموعہ کی "شانِ اشاعت" کیسے معلوم ہو گی؟

(۲)

۱۷/ شوال ۱۳۵۹ھ (۱۸/ نومبر ۱۹۴۰ء) کی شام بھلائے نہیں بھولے گی، علالت کی خبریں تو ایک ہفتہ سے مل رہی تھیں، لیکن مرض کی شدت کا احساس نہیں تھا، اسی لئے عیادت میں بھی سستی ہوئی......

۱۷/ کی صبح کو ہم لوگ (راقم، منصور کاکوی[1]، عبدالاحد فاطمی[2]) روانہ ہوئے، دس بجے پھلواری پہنچے، مولانا ہوش میں نہیں تھے، سانس زوروں پر چل رہی تھی، لیکن کسی کو خطرناک حالت کا احساس نہیں تھا۔

کوئی بارہ ایک بجے ڈاکٹر سید محمد عثمان صاحب تشریف لائے، تو خطرہ کی گھنٹی بجی، ہم لوگ عثمان صاحب کی گھبراہٹ دیکھ دیکھ کر سہمے جاتے تھے، بیچارے نے اپنی سی تمام تدبیریں کیں، تیمارداروں اور دوستوں نے دوڑ دھوپ میں کمی نہ کی، لیکن وقت پورا ہو چکا تھا، پھر بھی یہ بات ذہن میں نہیں آتی تھی کہ مولانا اس قدر جلد جدا ہو جانے والے ہیں۔ چار بج کر بیس منٹ پر ہم لوگ

---

[1] منصور احمد صاحب کاکوی، پروپگنڈا افسر محکمہ دیہات سدھار، اورنگ آباد دکن۔

[2] عبدالاحد صاحب فاطمی رکن ادارہ "الہلال" پٹنہ۔

رخصت ہوئے اور بیس پچیس منٹ کے بعد ہی یہ پاکباز ہستی جسے دنیا ابوالمحاسن محمد سجاد کے نام سے پکارتی تھی، اس دار فانی سے رخصت ہوگئی، رحمۃ اللہ رحمۃ الابرار الصالحین من عبادہ

(۴)

صبح کو پھر منصور اور عبدالاحد ملے، سب کے دل ٹوٹے ہوئے تھے، اور آنکھیں آمادۂ گریاں؛ لیکن لب کشائی کی ہمت نہیں ہوتی تھی، بات ہوئی، تو یہ کہ الہلال کا سجاد نمبر نکالا جائے اور ترتیب وتبویب یہ گنہگار کرے۔ خطوط لکھے گئے، مولاناؒ کے جاننے والوں اور ملنے والوں سے مضمون کی درخواستیں کی گئیں، خیال تھا کہ جنوری کے آغاز میں سجاد نمبر شائع ہوجائے لیکن کچھ ایسے حالات پیش آئے، کہ الہلال کی اشاعت ہی ملتوی ہوگئی، سجاد نمبر کے بدلے محاسن سجاد کی تجویز سامنے آئی، اور اس کا بار بھی عاجز کے کندھوں پر پڑا، اور صورتیں کچھ ایسی پیدا ہوگئیں، کہ اس مجموعہ کی ترتیب و اشاعت کا سارا کام اسی گنہگار کو کرنا پڑا، گو احباب کے مشورے اور ان کی عنایتیں برابر حاصل رہیں۔ بزرگوں میں خان بہادر مولانا مبارک کریم صاحب، مولانا محمد اصغر حسین صاحب بہاری (نائب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ) اور دوستوں میں مولوی سید محمد مجتبیٰ صاحب، مولانا شاہ احمد حبیب ندوی، مولانا سید منت اللہ رحمانی

منصور احمد کاکوی، عبد الاحد فاطمی صاحبان نے ہر قسم کی امداد دی، اور شروع سے آخر تک اپنی دلچسپی قائم رکھی۔ برادرِ عزیز زکریا صاحب فاطمی ندوی مدیر "ہلال" نے خاص طور پر ہر منزل میں ہاتھ بٹایا، گویا اس مجموعہ کی ترتیب میں وہ برابر کے شریک ہیں۔

(۴)

خطوط تو کم و بیش، مولاناؒ کے تمام ملنے والوں کو لکھے گئے۔ لیکن اکثر حضرات نے جواب کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ لکھنؤ کے ایک صاحب، (جو تحریک مدحِ صحابہ کے سلسلہ میں مولاناؒ کی خدمات اور مشوروں سے برابر فائدہ اٹھاتے رہے تھے) اس بے رخی سے پیش آئے، کہ حیرت ہوئی،

پہلی درخواست پر لبیک کہنے والوں میں مولانا امین احسن صاحب اصلاحی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی (مدیر "الفرقان" بریلی) خاص طور پر ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، گو ان کی عنایتیں شکریہ اور امتنان سے بہت بلند ہیں۔

استاذ محترم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے بھی آغاز سے ہمت بندھائی اور برابر اپنے مشوروں سے سرفراز فرماتے رہے، مخدومی مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مدظلہ، اس مجموعہ کے تمام ناظرین کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے انتہائی مشغولیت اور پریشانی میں ایسا دلاویز "پیش لفظ" لکھ کر عنایت فرمایا،

محترمی جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بالقابہ نے بھی ازراہ نوازش ایک مختصر مضمون سے اس مجموعہ کی زینت بڑھائی۔

'ذاتی حالات' کے سلسلہ میں، جن بزرگوں نے اس مجموعہ کے لئے لکھنے کی تکلیف گوارا کی، ان میں ایک بزرگ اور مولانا مرحوم کے خاص شاگرد مولانا عبد الحکیم صاحب بھی، اپنے محبوب استاذ کی صف میں جا ملے، اسی ربیع الاول ۶۰ھ کی پانچویں کو انہوں نے رحلت فرمائی، اللہ ان کی بال بال مغفرت فرمائے۔

مولاناؒ کے مقامی رفیقوں میں مولوی سید محمد مجتبیٰ صاحب ام، اے، بی، ال، اور مولانا سید منت اللہ رحمانی کے مضمون مجموعہ میں آگئے ہیں، مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی کا مقالہ امارت شرعیہ پر عدم گنجائش کے سبب سے نہ شائع ہو سکا، جس کا ہمیں انتہائی افسوس ہے،

راغب احسن صاحب کا مضمون شاید بہتوں کے لئے تکلیف دہ ہو، پر حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے، کہ اس کی اشاعت ناگزیر ہو گئی۔ راقم کے اصرار اور مسلسل درخواست پر برادر مکرم راغب صاحب نے یہ مقالہ عنایت فرمایا، اور پھر جب ان سے لہجہ نرم کرنے اور کچھ ترمیم و تبدیلی کی درخواست کی گئی، تو وہ راضی نہ ہوئے مجبوری میں ایک مفصل نوٹ آغاز میں دیا گیا ——— طباعت سے پہلے بعض دوستوں کی نظر اس پر پڑی، تو وہ اس نوٹ پر بھی مطمئن نہ ہوئے، آخر ان کے

اصرار سے برادرم جناب شمس ہاشمی کا جوابی مضمون بھی شامل کر لیا گیا' اور اس طرح اس "کتاب المناقب" میں "باب الجدل" کا مستقل اضافہ ہو گیا، جس کا ہمیں انتہائی رنج ہے؛

اس "باب الجدل" سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ بعض مفید مضمون مجموعہ میں نہ آسکے' نظمیں تو بالکل نہ دی جا سکیں، صرف برادرم سید احمد صاحب عروج کی نظم دی جا رہی ہے' جو انہوں نے' راقم کی فرمائش پر، خاص اسی مجموعہ کے لئے لکھی تھی۔

(۵)

اس مجموعہ کی اشاعت فروری کے آخر تک ہو جاتی' اگر کاتب صاحب کو چھٹی ہوتی اور وہ بروقت کتابت کر دیتے' ابھی تک پٹنہ میں اچھے کاتبوں کی بہت کمی ہے' اس لئے منشی محمد طاہر خاں صاحب کو چھوڑ کر، دوسرے کی طرف رجوع کرنا بھی گوارا نہ تھا' صرف کتابت کی دقتوں کے باعث ایک مہینہ کی تاخیر برداشت کرنا پڑی'

ارادہ تھا کہ مجموعہ بہترین طباعت سے آراستہ ہو' پر اپنی انتہائی کوششوں اور جناب مینجر صاحب برقی مشین پریس کی خاص توجہ کے باوجود بھی اس میں کامیابی نہ ہوئی'

کاپیاں راقم نے خود دیکھی تھیں اور پروف کی تصحیح برادر عزیز کریا حسب فاطمی

نے کی، پھر بھی غلطیاں رہ گئی ہیں، اب یہ میری چوک ہو، یا زکریا صاحب کی، امید کہ پڑھنے والے درگذر کریں گے، غلطیاں معمولی سی ہیں، بیک نظر معلوم ہو جائیں گی۔

(۶)

مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ کی سیرت اور خدمات سے متعلق یہ پہلی کتاب شائع ہو رہی ہے، لیکن توقع کی جاتی ہے کہ یہ آخری کتاب ثابت نہیں ہوگی، الہلال بک ایجنسی کے نام سے بعض دوستوں نے ایک دارالاشاعت کی بنا ڈالی ہے، اور ان کے ارادے بڑے ہیں، اللہ کرے ان کی کوششیں کامیاب ہوں اور دنیا مولانا مرحوم کے افکار و آراء سے پوری طرح واقف ہو سکے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

پھندرو، پٹنہ
۲۵ ربیع الاول سنہ ۹۰ھ

عاجز
مسعود عالم ندوی

ذاتی حالات

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ

(از مولانا حافظ عبدالحکیم صاحب اوگانوی مہتمم مدرسہ انوار العلوم گیا)

['ذاتی حالات' کے سلسلے میں چار مضمون شائع ہو رہے ہیں' ان کے لکھنے والے مولاناؒ سے خاص تعلق رکھتے تھے' مولانا عبدالحکیم صاحب تو عرصہ تک ساتھ کام کرتے رہے' اور مولاناؒ کے قائم کئے ہوئے مدرسہ انوار العلوم کے نظم و اہتمام کا سارا بار ان ہی کے کندھوں پر ہے۔

خان بہادر مولانا مبارک کریم صاحب سے مولانا مرحوم نے باضابطہ تلمذ کیا تھا۔ خود مولانا مبارک کریم صاحب کے بیان کے مطابق' مولاناؒ نے ان سے متوسطات تک کی کتابیں پڑھی تھیں' لیکن دوسرے جاننے والے اس کی تائید نہیں کرتے۔ ممکن ہے انہیں اس کا علم نہ ہوا ہو۔

اس سلسلے کا تیسرا مضمون خاص طور پر لائق ذکر ہے' مولانا اصغر حسین صاحب نے مولاناؒ کی تعلیمی زندگی کا مفصل اور مکمل خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں' اس پُر معلومات تحریر کے لئے ہم خاص طور پر شکر گذار ہیں۔

برادر محترم حکیم یوسف حسن خاں صاحب (جنہیں مولانا مبارک کریم صاحب، مولانا محمد حسین صاحب، اور مولانا مرحوم تینوں سے تلمذ کا شرف حاصل ہے) نے بھی الہ آباد کی زندگی کا مختصر اور مؤثر خاکہ پیش کیا ہے

ان چاروں مضمونوں کے علاوہ ہمیں مولوی سید شاہد حسین صاحب تنویر الہ آبادی (نبیرۂ مولانا عبد المکافی صاحب مرحوم) کی ایک مرتب کردہ یادداشت استاذ محترم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کے توسط سے ملی، جس سے مولانا کی تعلیمی اور تدریسی زندگی پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ حالات کے تکرار کے باعث ہم اسے نہیں چھاپ رہے ہیں، لیکن اعتراف حقیقت سے گریز ہوگا، اگر اس کا اظہار نہ کردیا جائے کہ ہمیں حواشی کی تحریر اور بعض واقعات کی تصحیح میں مولوی شاہد حسین صاحب کی اس یادداشت سے کافی مدد ملی۔ [م۔ع]

مولانا کی زندگی، خدمات اور فکر و عمل کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو اور جو معرض خفا میں ہو، تمام سوانح منظر عام پر آچکے ہیں، میں نے بھی مولانا کی زندگی کا پہلا ورق، کے عنوان سے مولانا کی خاص ابتدائی خدمات اور کارنامے حوالہ قلم کئے ہیں، اور آپ کی پیدائش، وطن، اور طرز زندگی وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے، جو عصر جدید وغیرہ میں آگیا ہے، مگر دل چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ سعادت میں شریک ہوں، اور حکم کی تعمیل میں مختصر کچھ لکھوں

ذکر نعمان لنا ان ذکرہ، ھو المسک ما کررتہ یتضوع۔

آپ کی پیدائش ۱۲۹۹ھ ہجری میں موضع پنہسہ ضلع پٹنہ میں ہوئی اور یہی آپ کا آبائی وطن ہے۔ ابتدائی تعلیم آپنے گھر ہی پر پائی۔ قرآن اور اردو فارسی سے فارغ ہوچکے بعد آپ کو تحصیل علم عربی کا شوق ہوا اور اپنے اطراف ہی میں غالباً مولانا وحید الحق مرحوم استھانوی اور مولانا عبدالوہاب[1] مرحوم بہاری سے عربی پڑھی اور جب متوسطات کے قریب پہنچے تو آپ دیوبند تشریف لے گئے۔ لیکن وہاں آپ کی علمی پیاس نہیں بجھی اسلئے تھوڑے ہی دنوں کے بعد آپ دیوبند سے الہ آباد مدرسہ سبحانیہ۔ چلے آئے اور حضرت مولانا عبدالکافی مرحوم کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے جو علوم عربیہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور ایک جید اور متبحر عالم تھے مولانا اپنی ذہانت، فطانت، استعداد اور قوت مطالعہ کے باعث تمام طلبہ پر نمایاں فوقیت اور امتیاز رکھتے تھے اور مولانا عبدالکافی صاحب آپ پر بہت شفقت فرماتے تھے آپنے شرح جامی اور قطبی سے لیکر بالاستیعاب تمام کتابیں مولانا ہی سے پڑھیں۔ اور ۱۳۲۱ھ[2] میں مدرسہ سبحانیہ ہی سے سند فراغ اور تکمیل آپنے حاصل کی۔ یہ غلط ہے جیسا کہ مولانا عظمت اللہ ملیح آبادی نے آپ کے سوانح کے سلسلہ میں "مدینہ" میں لکھا ہے کہ مولانا مرحوم نے حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ سے درس لیا اور آپ کے علمی اور روحانی فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے، مولانا بجیبی دتنیت

---

[1] مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم سے باضابطہ استفادہ کی تصدیق نہیں ہوتی۔ 'م' ع'

[2] مدرسہ سبحانیہ سے فراغت ۱۳۲۱ھ میں ہوئی، جیسا کہ نوری شاہد حسین صاحب سوز، (نبیرہ مولانا عبدالکافی مرحوم) کی ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے۔ 'م' ع'

دیوبند گئے تھے متوسطات بھی نہیں پڑھتے تھے' پھر حضرت شیخ الہندؒ کی بارگاہ اور حلقۂ درس تک کیونکر رسائی ہوئی؟ منتہی طلبہ کا مقام اور ہے اور غیر منتہی کا مقام اور۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولاناؒ کے علم و فضل، تبحر و قابلیت اور اذکار و اعمال سے متاثر ہو کر ملیح آبادی صاحب نے وہم کر لیا ہے کہ یہ حضرت شیخ الہندؒ ہی کے شاگرد ہو گئے اور اُن ہی سے فیض پایا ہوگا' حالانکہ یہ محض فضل اللہ ہے' وہ جس کو چاہے اپنے فضل سے نوازدے۔ حضرت مولانا ابوالکلام نے کس شیخ الہند کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا' اور کس علامۂ وقت سے پڑھا؟ مگر ان کے فضل و کمال' علم و ادب فہم و فقاہت' فکر و تدبر میں کون آپ پر فوق ہے؟ جس طرح مولانا عظمت اللہ کا یہ خیال غلط ہے اُسی طرح ان کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ جس زمانہ میں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حسین احمد صاحب گرفتار ہو کر مالٹا میں قید ہوئے اسی زمانہ میں مولانا سجاد علیہ الرحمۃ کے رفقائے کار بھی نظر بند کر دیئے گئے اور مولاناؒ پر اس کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اپنی علمی زندگی کو خیرباد کہا۔ اور درس و تدریس سے علٰحدہ ہو گئے اور مدرسہ انوار العلوم کو چھوڑ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولاناؒ کے رفقائے کار میں بجز ہم دو چار آدمیوں کے اور کوئی نہ تھا۔ اور آپ کا کوئی رفیق کار کبھی بھی کہیں نظر بند نہیں ہوا۔ البتہ

لے مولوی عظمت اللہ صاحب نے شیخ الہند مرحوم کے شاگردوں اور رفیقوں ہی کو مولاناؒ کے "رفقاء" سے تعبیر کیا ہے' گو یہ صحیح نہیں۔ رفقائے شیخ الہندؒ سے مولانا مرحوم کا تعارف بعد کی سیاسی تحریکوں کے سلسلہ میں ہوا۔ 'م' ع'

مولانا کے نوعمر مگر پُرجوش صاحبزادے حسن سجاد مرحوم تحریک خلافت کے سلسلے میں بارہ برس میں ایک تقریر کے جرم میں اسیر فرنگ ہوئے اور غالباً چھ مہینے کی سزا ہوئی۔ واقعات کو صحت کی روشنی میں پیش کرنا چاہیے اور قیاس اور وہم سے بچنا چاہیے۔

بہر حال مولاناؒ ۱۳۲۰ھ میں مدرسہ سبحانیہ سے فارغ ہو کر اپنے مکان تشریف لائے اور چند دنوں کے بعد مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں ملازم ہوئے اور درس دینے لگے۔ آپ کی قابلیت، استعداد اور تبحر علمی کا شہرہ سُن کر طلبہ جوق جوق آنے لگے اور تھوڑے دنوں میں یہ اچھا خاصا مرکز علم بن گیا۔ پھر چند سال کے بعد آپ کو مولانا عبد الکافی صاحب نے اپنے مدرسہ سبحانیہ کے لئے الہ آباد میں بلوالیا اور صدر مدرس کی نیابت کے عہدہ پر آپ کو سرفراز کیا۔ میں اُس زمانے میں کانپور میں پڑھتا تھا جب یہ معلوم ہوا کہ مولاناؒ الہ آباد تشریف لے آئے ہیں، تو میں کانپور سے الہ آباد چلا آیا اور مولاناؒ کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہوگیا، اور اپنی بقیہ کتابیں مولاناؒ ہی سے تمام کیں اسلئے آج مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں مولاناؒ کا شاگرد ہوں اگرچہ حقیر اور کمترین ہوں۔ یوں تو مولاناؒ جامع العلوم تھے مگر جن علوم میں کافی بلکہ کافی سے زیادہ دستگاہ رکھتے تھے، وہ منطق، فلسفہ، بلاغت اور علم ادب تھا۔ کانپور میں کوئی عالم آپ کے پایہ کا نہ تھا اور الہ آباد میں بھی بجز مولانا نصیر الدین مرحوم الہ آبادی کے کوئی مدرس عالم آپ کا ہمسر نظر نہ آیا۔ مولاناؒ کے درس تدریس کا یہ حال تھا کہ بڑی محنت اور کاوش سے پڑھاتے تھے اور کتاب کے مطالب مع مالہٗ وما علیہ اس آسانی سے طلبہ کے دماغ میں اُتار دیتے تھے کہ دماغ چمک اُٹھتا تھا۔ مولاناؒ کے طرز تدریس کی بڑی شہرت اور دُھوم رہی اور

بہت سے تشنہ کو ماں علم اس چشمہ سے سیراب ہوئے اور اپنی پیاس بجھائی۔ مولانا مسلسل پانچ چھ برس تک درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے اور مشغول خدمت ہی تھے کہ مولانا عبد الکافی صاحب کی ہدایت یا اجازت سے گیا میں تشریف لائے جہاں پوری جہالت اور بے دینی چھائی ہوئی تھی اور مدرسہ انوار العلوم قائم کیا۔ یہ ۱۳۲۹ھ کا واقعہ ہے مدرسہ کے قیام کے سلسلہ میں کن کن مشکلات اور موانع کا سامنا ہوا اور کیا تکلیفیں اور صعوبتیں اٹھانی پڑیں یہ ایک داستان لرزہ خیز اور حیرت انگیز ہے جن کو کچھ میں ہی جانتا ہوں کیونکہ میں مولانا کا رفیق اور ساتھی تھا۔ آخر کسی طرح مدرسہ قائم ہوا، چلا اور علم دین کی روشنی پھیلی اور اجالا نظر آیا۔ تقریباً بارہ برس تک مولانا انوار العلوم میں درس دیتے رہے اور اس درمیان میں برابر سیاسیات حاضرہ کا بھی مطالعہ فرماتے رہے چنانچہ تحریک خلافت کے زمانے میں سیاسیات میں داخل ہوئے اور آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد ہندوستان اور خصوصاً بہار میں کوئی سیاسی تحریک ایسی نہیں تھی جس میں آپ شریک نہ ہوئے ہوں اور عملی حصہ نہ لیا ہو بلکہ کامیاب نہ بنایا ہو اور کامیاب بنانے کی کوشش نہ کی ہو لیکن انوار العلوم کے بعد سب سے پہلا اہم اور نمایاں کام گیا میں خلافت کمیٹی کی تاسیس تھی۔ مولانا نے قاضی احمد حسین صاحب وغیرہ کی معاونت سے گیا میں خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی جو صوبہ میں پہلی خلافت کمیٹی تھی اور ہزاروں ہزار روپیہ ترکی کو بھجوایا اور خوب چندہ ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ غالباً یوم انقرہ کے سلسلہ میں میں نے گیا کے ایک چھوٹے سے محلہ سے ڈیڑھ سو روپیہ وصول کرکے دفتر میں داخل کیا تھا۔

مولاناؒ نے بھی عجیب دل و دماغ پایا تھا۔ مدرسہ میں پڑھاتے بھی تھے، مدرسہ کی نگرانی اور اس کا نظم بھی کرتے تھے، پھر وقتی سیاست، مسلمانوں کی زبوں حالی، آپس کے نفاق و شقاق اور علما کے تفرق و انتشار اور لامرکزیت کو گہری نظر سے دیکھتے تھے اور ان کی اصلاح کی تڑپ بھی دل میں رکھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کسی طرح عوام اور علما کی کچھ بھی اصلاح ہو جائے، اور یہ دینی فرائض سمجھنے لگیں، یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولاناؒ نے چند علما کے مشورہ سے بہار میں ۱۳۲۵ھ میں جمعیۃ علمائے صوبہ بہار، قائم کیا اور بہت جلد اس کو ترقی اور افادیت کے مرتبہ پر پہنچایا۔ صوبہ کے مختلف شہروں میں اس کے عظیم الشان پیمانہ پر اجلاس ہوتے رہے اور عوام اور علما کی بتدریج تنظیم و اصلاح ہوتی گئی یہ بھی ایک اہم خدمت تھی جس کو مولاناؒ نے انجام دیا اور تکمیل کو پہنچایا۔ لیکن جو چیز زیادہ تڑپا رہی تھی، اور موجب رنج بنی ہوئی تھی وہ مسلمانوں کی غیر اسلامی اور غیر شرعی زندگی تھی آخر بہت غور و خوض کے بعد امارت شرعیہ کی اسکیم آپ کے ذہن میں آئی، اس سلسلے میں مولانا مرحوم نے رانچی میں حضرت مولانا ابوالکلام صاحب سے جو اس وقت وہاں نظر بند تھے ملاقات کی اور اس مسئلہ پر باہمی مشورہ اور تبادلۂ خیال ہوا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور دیگر سربرآوردہ علماء سے بھی ملے اور رائے عامہ کو تیار کیا اور جب یہ مرحلہ ختم ہو گیا تو غالباً ۱۳۳۹ھ میں پٹنہ میں مولانا ابوالکلام صاحب کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں تمام علماء اور عمائدین مدعو کئے گئے اور کافی بحث و تمحیص کے بعد امارت شرعیہ کے قیام کی تجویز پاس ہوئی، اور اسی جلسہ میں حضرت شاہ بدرالدین صاحب پھلواری امیر شریعت منتخب ہوئے، بعد کو مولانا مرحوم نائب امیر شریعت

مقرر ہوئے اور دفتر وغیرہ قائم ہوا اس کے بعد بہار کے مختلف شہروں میں مولانا سید شاہ محی الدین اور مولانا مرحوم کی سرکردگی میں امارت کا وفد گشت لگاتا رہا اور مسلمانوں سے شرعی اور اسلامی زندگی بسر کرنے کا عہد و پیمان اور قول و قرار لیتا رہا اور دیکھا گیا کہ مسلمانوں نے پوری عقیدت اور خلوص کے ساتھ وفد کا خیر مقدم کیا۔ اور اطاعت اور فرماں برداری کا یقین دلایا۔

بہر کیف، اب مولاناؒ کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ وہ گیا اور مدرسہ کی ہمہ ہمی زندگی کو چھوڑیں، اور پھلواری شریف میں اقامت اختیار کریں۔ چنانچہ مولاناؒ مدرسہ کو میرے حوالہ کر کے پھلواری شریف تشریف لے گئے اور افسوس کہ وہیں پیوند خاک ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولاناؒ نے دو بیوہ ایک بچہ ایک بچی اور دو لڑکیاں چھوڑ کر رحلت فرمایا۔ خدا ان کو سلامت رکھے اور معاشی تکلیف سے بچائے۔ آمین۔

مولانا مرحوم کی تین یادگاریں ہیں جو خالص دینی ہیں، مدرسہ انوار العلوم۔ جمعیۃ علمائے صوبہ بہار اور امارت شرعیہ۔ کوشش کرنی چاہیے کہ یہ یادگاریں قائم اور برقرار رہیں اور ان کی خدمات اور افادیت عام سے عام تر ہوتی جائیں تاکہ مولاناؒ کی روح مطمئن اور مسرور رہے۔

مولاناؒ کے سیاسی کارنامے اور خدمات مثلاً نہرو رپورٹ پر بحث و تنقید، سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تائید، انڈیپینڈنٹ پارٹی کا قیام اور پارٹی کی طرف سے الیکشن کی جنگ، اور اسمبلیوں اور کونسلوں کی نگرانی کہ کوئی قانون مذہب اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف پاس نہ ہو، یہ وہ چیزیں ہیں جو روشنی میں آ گئی ہیں اسلئے ان مسائل پر مزید لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لہذا مضمون کو ختم کرتا ہوں۔ والسلام

سوانح سجّادؒ

مرتبہ جناب زکریا فاطمی صاحب مدیر "الہلال"

[صوبہ کے مشہور و معروف ذی علم بزرگ جناب خان بہادر مولانا ابونعیم محمد مبارک کریم صاحب سابق سپرنٹنڈنٹ آف اسلامک اشٹڈیز بہار واڑیسہ نے مولانا مغفور کے سوانح سے متعلق گراں قدر معلومات تحریر فرما کر دیئے تھے مگر وہ یادداشتوں کی شکل میں تھے۔ راقم نے کوشش کی ہے کہ اختصار کے ساتھ اور خان بہادر صاحب موصوف کے الفاظ کو جا بجا باقی رکھتے ہوئے یہ مفید معلومات قارئین کرام تک پہنچا دی جائیں۔ فاطمی]

خاندان اور ابتدائی حالات

حضرت مولاناؒ کا اسم گرامی محمد سجاد اور کنیت ابوالمحاسن تھی، والد کا اسم گرامی مولوی شیخ حسین بخش (مرحوم) اور عم محترم کا مولوی شیخ مخدوم بخش (مرحوم) تھا، ان کا خاندان علمی لحاظ سے ذی استعداد اور باذوق خاندان تھا۔ حضرت مولاناؒ کا آبائی وطن موضع پنہسہ (ضلع پٹنہ) ہے جو بہار شریف سے دکھن راجگیر جانے والی سڑک پر ۲ میل کے اندر واقع ہے۔ اسی موضع میں حضرت مولاناؒ ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا مرحوم کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں شروع ہوئی اور اپنے والد ماجد نیز اپنے برادر کلاں مولوی احمد سجاد صاحبؒ (جو اس وقت بھی ماشاء اللہ بقید حیات ہیں اور عابد مرتاض ہونے کی وجہ سے "صوفی جی" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں) قرآن مجید اور ابتدائی اردو و فارسی کی تعلیم پاتے رہے۔

مدرسہ اسلامیہ بہار شریف

ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے برادر کلاں کے حسب مشورہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں داخل کیے گئے، وہاں آپ نے اپنے رشتہ کے بزرگ حضرت مولانا سید وحید الحق صاحب ساکن موضع استھانواں (ضلع پٹنہ) بانی مدرسہ کے کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ آپ کے برادر موصوف پہلے ہی سے مدرسہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے چنانچہ اس دوران میں آپ کی نگرانی بھی کرتے رہے۔ غالباً یہ واقعات سنہ ۱۳۱۰ھ کے ہیں۔

جس زمانے میں مولانا مدرسہ اسلامیہ بہار کی ابتدائی جماعتوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اسی زمانہ میں مولانا محمد مبارک کریم صاحب بھی اوپر کے درجوں میں تحصیل علم ہی میں مشغول تھے تو جیسا کہ عام طور پر عربی مدارس کا قاعدہ ہے کہ اگلے درجوں کے طلبہ کو ابتدائی جماعتوں کے طلبہ کی تدریس کے فرائض سپرد کیے جاتے ہیں اسی طرح مولانا مبارک کریم صاحب کے ذمہ بھی مولانا مغفور کی ابتدائی تعلیم کے فرائض سپرد کیے گئے۔ اس سے اوپر کی تعلیم مولانا نے بعض کانپور اور متوسطات (شرح جامی وغیرہ) سے لیکر انتہا تک مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں حاصل کیا جیسا کہ آئندہ سطروں سے معلوم ہوگا۔

کانپور کا سفر

زاں بعد جبکہ حضرت مولانا سید وحید الحق صاحب موصوف کی خرابی صحت کے باعث مولانا مبارک کریم صاحب نے بغرض حصول تعلیم کانپور جانے کا عزم کیا تو مولانا مغفور بھی ان کے ہمراہ عازم کانپور ہوئے اور وہاں جا کر مولانا سید احمد حسن صاحب مرحوم کانپوری کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ کچھ عرصہ کی تحصیل علم کے بعد مولانا کی علمی استعداد متوسطات تک پہنچ چکی تھی اور عام معمول کے مطابق مولانا بھی اپنے سے نیچے درجوں کے طلبہ کی تعلیم میں حصہ لیتے تھے۔

اسی اثنا میں مولانا مرحوم کانپور سے دیوبند گئے، مگر وہاں اپنے علمی مذاق کی تسکین کا سامان نہ پاکر چند ماہ کے قیام کے بعد پھر کانپور واپس آئے اور پھر کچھ عرصہ کے لئے وہیں قیام رہا۔ مجموعی طور پر تین سال تک مولاناؒ نے کانپور میں تعلیم حاصل کی۔

مراجعت وطن اور ازدواج

اس کے بعد آپ مکان واپس تشریف لے آئے کچھ عرصہ کے بعد آپ کی شادی حضرت مولانا سید وحید الحق صاحب مرحوم کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تک آپ گھر کے اور سسرال کے کاموں میں اس طرح الجھے رہے کہ تعلیم کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا۔

الہ آباد میں

مگر پھر اپنے شوق اور بہی خواہوں کے مشورے کے مطابق بغرض تکمیل حضرت مولانا عبد الکافی صاحب مرحوم بانی و مدرس مدرسہ سبحانیہ الہ آباد کی خدمت میں پہنچے جو اپنے وقت کے بہت مشہور اور جید عالم تھے۔

مولاناؒ نے الہ آباد میں کئی سال صرف کئے، اور اپنی ذہانت، مذاق صحیح، زود فہمی، سلیم الطبع اور جید علمی استعداد کی بدولت حضرت مولانا عبد الکافی مرحوم کے دست و بازو کی حیثیت بھی رکھتے تھے، اور اور وہ اس طرح کہ مدرسہ مذکورہ کے دوسرے منتہی درجوں کے طلبہ کو بھی اپنی علمی قابلیت کی بنا پر تعلیم دیا کرتے تھے۔

تکمیل ہو چکی تو مولانا عبد الکافی مرحوم نے آپ کی دستار بندی کے جلسہ میں ہندوستان کے نامی گرامی علماء کو مدعو کیا، اور تمام معزز مہمانوں کی موجودگی میں دستار بندی ادا ہوئی۔ لوگوں کا بیان ہے کہ اتنا شاندار

جلسہ الٰہ آباد میں اس سے قبل کبھی نہیں ہوا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ الٰہ آباد اور اس کے اطراف کی پبلک دور دور سے آکر شریک جلسہ ہوئی اور علماء میں بھی تقریباً تمام سربرآوردہ علمائے ہند موجود تھے۔

درس و تدریس۔ بہار و الٰہ آباد

فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک مدرسہ سبحانیہ کی طرف تشنہ کامانِ علوم اور معاونین کی توجہ زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی مگر پھر بعض بہی خواہوں مثلاً مولانا محمد مبارک کریم صاحب وغیرہ کے اصرار پر اپنے استاذ اور خسر حضرت مولانا سید وحید الحق صاحب مرحوم کے قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں آکر تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ آپ کی شہرت سن کر طلبہ جوق در جوق آکر جمع ہوئے اور مدرسہ کی نیک نامی کو چار چاند لگ گئے۔

جب آپ الٰہ آباد سے بہار شریف جانے لگے تو آپ کے ساتھ متعدد ایسے طلبہ بھی ساتھ ہو گئے جو آپ کی طرزِ تعلیم اور اُستادانہ شفقت کے گرویدہ تھے۔ یہ طلبہ عرصہ دراز تک مدرسہ اسلامیہ بہار میں آپ کے حلقۂ درس میں شامل رہے۔ آپ کے ان شاگردوں میں مولانا عبد الرحمٰن جونپوری بھی ہیں، جو اس وقت مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے صدر مدرس ہیں۔ علاوہ ازیں مولانا محمد اصغر حسین بہاری (حال نائب پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ) مولانا حافظ عبد الرحمٰن صاحب (مدرس مدرسہ مذکور) اور مولوی محمد شرافت کریم برادر مولانا مبارک کریم صاحب موصوف بھی مدرسہ اسلامیہ میں پہلے ہی سے زیر تعلیم تھے، آپ کی تشریف آوری کے بعد یہ لوگ بھی آپ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔

کئی سال تک مدرسہ اسلامیہ بہار میں رہنے کے بعد آپ اپنے استاذ حضرت مولانا عبدالکافی صاحب مرحوم کی طلب و اصرار پر پھر الٰہ آباد تشریف لے گئے۔ اور مدرسہ سبحانیہ میں نائب مدرس اول مقرر ہوئے۔

گیا میں

الٰہ آباد میں بھی کئی سال تک آپ کا قیام رہا۔ اس کے بعد حسب ارشاد حضرت مولانا عبدالکافی صاحب مرحوم، آپ گیا تشریف لائے اور وہاں جاکر آپ نے مدرسہ انوار العلوم کو دوبارہ جاری کیا، جو قاضی فرزند احمد صاحب رئیس گیا کے صاحبزادہ قاضی انوار احمد مرحوم کے نام سے شمس العلما مولانا عبدالوہاب فاضل بہاری کا قائم کیا ہوا تھا۔ مگر شمس العلما مرحوم کے الگ ہو جانے کے باعث بند ہو گیا تھا۔

المختصر جس وقت آپ تشریف لائے، گیا میں کوئی مدرسہ نہیں تھا۔ اور ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ کوئی عربی درس گاہ جاری کی جائے، چنانچہ آپ نے مدرسہ انوار العلوم کو جاری فرمایا۔ اس مدرسہ کا فیض دور دور تک پہنچا اور نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ دوسرے صوبوں کے تشنہ گان علوم بھی اس کے چشمۂ فیضان سے سیراب ہوتے رہے، مدرسہ کے جلسہ افتتاح اور سالانہ دستار بندی کے جلسوں میں نامی گرامی علمائے کرام تشریف لایا کرتے تھے جس سے گیا کی پبلک بھی مستفید ہوا کرتی تھی۔

آپ کی سعی بلیغ سے مدرسہ کو نہ صرف معنوی ترقی بلکہ صوری ترقی بھی ہو گئی، مدرسہ کی شاندار عمارت تعمیر ہوئی، دارالاقامہ بھی تعمیر ہو گیا اور بہتیرے غیر مقامی طلبہ کے نہ صرف قیام بلکہ طعام کا بندوبست

بھی باضابطہ ہو گیا۔

اصلی مشن

یہ سب کچھ تھا مگر مولانا مرحوم اپنے دل میں جسکی تڑپ محسوس کر رہے تھے، وہ کوئی اور چیز تھی، چنانچہ جب آپ کو مدرسہ کی طرف سے اطمینان ہو تو آپ نے مدرسہ کا انتظام اپنے لائق ترین شاگرد مولانا عبدالحکیم صاحب کے سپرد فرمایا اور خود علمائے صوبہ کو منظم کرنے، اور ان کی وساطت سے بے عمل مسلمانوں کو اس کا پابند کرنے کے لئے باضابطہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا، اور غور وفکر کے بعد قیام امارت کا خاکہ آپ کے ذہن میں آیا، اس اسکیم کے بروئے کار لانے کے لئے آپ نے اپنی تمام کوششیں وقف کر دیں اور خدا کے فضل سے آپ کی کوششوں ہی کا نتیجہ امارت شرعیہ بہار کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔

امارت شرعیہ کی اسکیم کیا ہے؟ اس پر مفصل مضمون کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں، اجمالی طور پر یہاں یہ لکھنا مناسب ہو گا کہ اس اسکیم کی رو سے پورے صوبے کو درجہ وار علاقوں میں تقسیم کیا گیا، اور تبلیغ واشاعت اسلام کے لئے ہر جگہ مبلغین اور نقباء کا سلسلہ قائم کیا گیا، فتاویٰ اور باہمی جھگڑوں کے فیصلے کے لئے قاضیوں کا تقرر عمل میں لایا گیا، اور اس تمام مشنری کو بروئے کار لانے کے لئے، زکوٰۃ، صدقات اور عشر وغیرہ کی تحصیل کے لئے تحصیلین اور عمال جابجا مقرر کئے گئے۔ علاوہ ازیں مذبذب اور متزلزل ایمان رکھنے والی جماعتوں میں عقائد اسلامیہ کے استحکام اور پابندی احکام کی تبلیغ کی گئی، مرتدین اور برگشتہ ایمان لوگوں کو دائرہ اسلام میں واپس لانے کی جدوجہد ہوئی، اور غیر مسلمین میں اسلام کو کما حقہ روشناس کیا گیا، اور

اس طرح کثیر تعداد مخلوق خدا آپ کی فیض رسانیوں سے مستفید ہوئی۔

ایثار مولانا مرحوم تقریباً ۲۲-۲۳ سال تک قومی سرگرمیوں میں بلا معاوضہ اور بدون توقع کسی صلہ سرگرم کار رہے۔ نہ دن کو دن سمجھا اور نہ رات کو رات، اپنے بال بچوں اور اعزہ و اقربا تو کیا خود اپنے نفس کے آرام کا بھی مطلق خیال نہ کیا۔ اگر دل میں کوئی درد تھا تو قوم کا اور سر میں کوئی سودا تھا تو اسلام کا۔

آپ کی ان جانکاہیوں اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے سلسلہ میں اس حقیقت کا انکشاف بے محل نہ ہوگا کہ آپ نے اس راہ میں نہ صرف اپنے آپ کو وقف کر دیا بلکہ حق تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں آنے کے پہلے بہت بڑی مقدار میں کاشت اور کچھ مالکانہ حصوں کے مالک بھی تھے جو آپ کے کلیتہً قومی کاموں میں مصروف رہنے کے باعث خراب و خستہ ہو گئے اور صرف یہی نہیں کہ آپ نے ذاتی و نادر علمی تبحر" گھر کا اثاثہ بلکہ اپنے جوان بیٹے مولوی محمد حسن سجاد مرحوم کو بھی قربان کر دیا، انتہا تو یہ ہے کہ انتقال کے وقت آپ کے دوا علاج کے لئے کوئی کافی سامان نہ ہو سکا اور انتقال کے بعد پس ماندگان بیوی، بچوں کے لئے قوت لایموت کا کوئی اطمینان بخش ذریعہ بھی موجود نہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وفات مولانا عمر کی تقریباً ۶۰ منزلیں طے کر کے سترہویں شوال المکرم ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸ نومبر ۱۹۴۰ء روز دو شنبہ کو بوقت پونے پانچ بجے شام بمقام پھلواری شریف انتقال فرما گئے، اسی روز دن گذار کر تقریباً ۱۱ بجے شب کو خانقاہ پھلواری شریف کے قبرستان میں

مدفون ہوئے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ سقی اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ ۔ آمین ۔

تالیف وتصنیف جہاں تک اندازہ ہے آپ نے اپنے زمانۂ تدریس میں شاگردوں کے لیے مختلف کتب کے حواشی تالیف کیے تھے ، اس کے علاوہ آپ کے مؤقر مضامین اخبارات اور رسائل میں برابر شائع ہوتے رہے ہیں ، نیز بعض رسالے بھی مختلف سیاسی مذہبی تحریکوں سے متعلق شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ ان کام افادات کو یکجا کر کے شائع کیا جائے[1] تاکہ عوام اس سے مستفید ہو سکیں ، خدا راست لائے ۔ آمین ۔

---

[1] بحمد اللہ مولانا کے مضامین کی ترتیب کا کام ، ان کے لائق عزیز وشاگرد مولانا سید رحمت اللہ رحمانی ایم ۔ ایل ۔ اے نے شروع کر دیا ہے ۔ م ۔ ع

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ

مختصر تعلیمی و سیاسی زندگی

(از جناب مولانا محمد اصغر حسین صاحب بہاری نائب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ)

دائرہ شاہ اجمل الہ آباد میں مولوی عبدالحمید جونپوری کی کوٹھی ہے جس کے ایک گوشہ میں چھپر کا ایک سائبان ہے اس میں چند طلبہ کے ساتھ حضرت مولانا مولوی ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ قیام پذیر ہیں۔ اور درس نظامی کی انتہائی کتابوں کی تحصیل میں حضرت مولانا حافظ عبدالکافی قدس سرہ اور مولوی عبدالحمید جونپوری مرحوم کو دلیل راہ بنائے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوالمحاسنؒ کے ساتھ دو تین بزرگ اور بھی شریک درس ہیں۔ لیکن مولاناؒ کی شان نرالی ہے۔ بستر کے سرہانے کروٹ میں کتابیں قطار در قطار رکھی ہیں۔ جن کے مطالعہ میں انہماک ہے، یا بعض طلبہ کے درس دینے سے سروکار ہے۔ حافظ عبدالکافی قدس سرہ نے چوک الہ آباد کی مسجد کے احاطہ میں مدرسہ سبحانیہ قائم کر رکھا ہے جس میں عموماً طلبہ پڑھتے ہیں لیکن حضرت سجادؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کے شوق میں کم از کم ایک سبق بھی ضرور رکھنا چاہتے ہیں اور جو ہمیں یا وقع ملا پڑھ رہے ہیں۔ اس کشش سے ظاہر ہے کہ طلب علم ہی کے زمانہ سے آپ کی تعلیم میں فنا طلبی اثر تھا۔ ادھر اساتذہ کی عنایات و توجہات سے عیاں ہو رہا تھا کہ ان حضرات کے لئے حضرت

سجادؒ کی شاگردی ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کی خاص توجہ اور قدردانی بالکل بجا تھی۔ گو اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ اس شمع طالب سے علمی نور پھیلنے کے علاوہ اس کے ناخنِ فکر و تدبیر سے سیاسی و اجتماعی عقدوں کا بھی حل ہونے والا ہے اور اسلامی ہند کے مفکرِ اعظم ہونے کی حیثیت سے مذہبی سیاست کی گتھیوں کے ایک ایک تار کو سلجھا کر رکھ دینے والا ہے۔ لیکن ذہانت، فطانت، قوتِ حافظہ، شوقِ مطالعہ، سلامت روی، سادگی، محنت، اور اطاعت شعاری جو جو صفتیں جاذبِ توجہ ہو سکتی ہیں، حضرت سجادؒ میں بدرجہ کمال موجود تھیں، اس لئے ان کی عنایات و توجہات کا منعطف ہونا ناگزیر تھا۔

اس ہنگام طالب علمی کے شاگردوں میں مولانا فرخند علی مرحوم سہسرامی کی ذات بابرکات تھی، جن کے علم و عمل کا فیض مدرسہ خیریہ سہسرام کی شکل میں اب بھی جاری ہے، اور جو عمر بھر سیاسیات میں اپنے استاذ محترم حضرت مفکرِ اعظمؒ کے دست و بازو رہے۔ اور اسی دور کے تلامذہ میں سے محشیؔ مولانا حافظ عبد الرحمٰن بادشاہ پوری جونپوری (فی الحال مدرس اول مدرسہ امدادیہ دربھنگہ) اور جناب حکیم مولوی محمد یعقوب صاحب ساکن گرڑا (گیا) بھی ہیں۔

میں بھی اسی اثنا میں قطبی وغیرہ پڑھتا ہوا تعلیمی غرض سے الہ آباد پہنچا تھا اور شریک درس ہونے والا تھا۔ لیکن بعض اسباب کی بنا پر مجھے اپنے وطن بہار شریف واپس ہونا پڑا۔ اور اس وقت حلقۂ درس میں داخل نہ ہو سکا۔ غالباً یہ سنہ ۱۹ یا ۱۳۲۰ھ کا واقعہ ہے۔

جب حضرت مولاناؒ فارغ ہو کر پنہسہ اپنے دولتخانہ تشریف فرما ہوئے، تو مدرسہ اسلامیہ

بہار شریف کے ناظم حکیم حافظ وحید الحق مرحوم اور مدرس اوّل جناب خان بہادر مولانا مبارک کریم صاحب مدظلہ نے مدرسہ موصوف میں درس دینے کے لیئے ان خصوصیات کی بنا پر جو حضرت موصوف کو مدرسہ سے تھیں زور دیا۔

حضرت کی ابتدائی تعلیم اسی مدرسہ میں ہوئی تھی' اور حضرت جامع کمالات مولانا سید وحید الحق استھانوی رحمۃ اللہ علیہ بانی مدرسہ کے خاص رشتہ دار ہونے[1] کے علاوہ چھوٹے داماد بھی تھے' وقت ومقام کے لحاظ سے درس وتدریس کے دلی جذبات کے اظہار کا موقع مدرسہ اسلامیہ سے کوئی بہتر نہ تھا۔ اہل جوار کی علمی خدمت کے ساتھ اپنے مخلص بزرگ کے شجر علم کی آبیاری' اور قرب مکان کی وجہ سے خانگی ضروریات کی نگرانی میں آسانی متصور تھی۔ غرض یہ کہ دونوں بزرگوں کی خواہش پر مدرسہ اسلامیہ تشریف لے آئے اور درس جاری فرمادیا۔ مزاج کی نرمی، عفو ودرگذر کی طینت اور طلبہ کی ہمدردی کے ساتھ جو اپنی طباعی اور انہماکی شان سے شب وروز درس وتدریس کی مہم شروع کی تو تھوڑے ہی عرصہ میں مدرسہ کے تعلیمی قالب میں نئی رُوح پھونک دی۔ ایک مدت سے مدرسہ قائم تھا لیکن شرح وقایہ، جلالین شریف، قطبی میر قطبی وغیرہ سے اوپر پڑھنے والے طلبہ کبھی نہ رہے' جہاں ملا حسن وغیرہ پڑھنے کی نوبت آئی اور یو۔ پی کی راہ لی۔ مگر حضرت ابوالمحاسنؒ کے پُرمحبت درس نے ایسی سحر کاری کی کہ اب طلبہ مدرسہ میں جمنے لگے۔

---

[1] حضرت مولانا وحید الحق کی اہلیہ، مولانا مرحوم کی چچا زاد بہن تھیں۔ 'م' ع'

چنانچہ میں بھی میر زاہد رسالہ اور ترمذی شریف تک پہنچ گیا۔

ہر اسلامی مدرسہ کے دستور کے مطابق اس مدرسہ میں بھی سالانہ تقریری امتحان شہر کے خاص خاص علما لیتے تھے۔ لیکن حضرت مفکر اعظمؒ نے اس سلسلہ میں عامۃ المسلمین کی توجہ مدرسہ کی طرف منعطف کرانے کے لئے ایک خاص تدبیر کی بنیاد ڈالی۔ مدرس اول و ناظم مدرسہ کے مشورہ سے سالانہ امتحان کے موقع پر ممتحنین کے علاوہ دیگر حضرات اہل علم و فضل اور عامہ خلائق کو بھی دعوت دینی شروع کی۔ اور امتحانات کے مناظر کا مشاہدہ کرانے کے ساتھ اُنکی دلچسپی و کشش کے لئے چائے بسکٹ سے تواضع کرنے کا سلسلہ قائم کیا جسکی وجہ سے ایک دو روز مدرسہ میں خاصی چہل پہل ہونے لگی۔ ممتحن و طلبہ کے گرد اگرد دوسرے حضرات اہل علم امتحان کی کیفیت کا تماشہ کرنے کو بیٹھ جاتے تو اُس وقت تعلیمی نمائش کا قابل دید منظر ہوتا تھا۔ مولانا محمد حسن استھانوی غفرلہ تلمیذ مولانا ہدایت اللہ خان صاحب مرحوم جو کسی زمانہ میں مدرسۂ اسلامیہ کے مدرس اول بھی رہ چکے تھے امتحان کے لئے تشریف لائے۔ اور میر زاہد رسالہ مع حاشیہ غلام یحیٰی بہاری کے امتحان کے سلسلہ میں، میں اور مولانا حافظ عبدالرحمٰن[1] جونپوری پیش کئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ آج ایک عجیب منظر دیکھنے میں آرہا ہے کہ بہار شریف میں ان کتابوں کے پڑھنے والے طلبہ موجود ہیں۔ پھر جو انہوں نے اپنی منطقیانہ شان سے امتحان

---

[1] مولانا عبدالرحمٰن جونپوری آجکل قدیم طرز کے معقولی علماء میں خاص امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ "م ع"

لینے کے دوران میں سوالات شروع کئے اور ہم دونوں جوابات دینے لگے تو اُس دن کے اس منظر کی لذت آج بھی اہل علم بزرگوں کے کام و دہن میں باقی ہے۔ مولانا سید شاہ محمد اسمٰعیل[1] غفرلہ (مدرس فقہ مدرسہ عالیہ کلکتہ) سے جب ملنے کا اتفاق ہوتا تو اس امتحانی مظاہرہ کا تذکرہ مزہ لے لیکر فرمایا کرتے۔ پھر اپنی تعلیمی ترقی ہوئی کہ درس نظامی سے پوری فراغت اس مدرسہ میں ہونے لگی۔ مگر میں خانگی وجوہ کی بنا پر مولاناؒ سے الگ ہوکر الہ آباد مدرسہ سبحانیہ چلا گیا اور یہاں ایک سال رہ کر مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد میں مولانا منیر الدین ناروی الہ آبادی غفرلہ تلمیذ رشید حضرت مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہوگیا۔ اس عرصہ میں مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے کچھ طلبہ فارغ ہو گئے جن کی دستار بندی کے جلسہ میں شرکت کے لئے دیگر علمائے کرام کے علاوہ استاذ محترم مولانا منیر الدین غفرلہ کو بھی تکلیف دی گئی اور حضرت مفکر اعظمؒ کی تجویز و تحریک سے مجھ کو بھی استاذ مکرم مولانا منیر الدین الہ آبادی کے خادم کی حیثیت سے بلایا گیا۔ چنانچہ میں بھی جناب استاذؒ کے ساتھ اس جلسۂ دستار بندی میں شریک ہوا۔ بہار شریف میں مدرسہ قائم ہونے کے مدتوں بعد یہ پہلا زریں موقع تھا جس میں درس نظامی کے فارغین کو سند تکمیل عطا ہوئی اور بیضاوی شریف میں امتحان لئے جانے کے بعد ان کے سروں پر دستار فضیلت باندھا گیا۔ اس جلسہ میں عمائدین شہر اور عوام بڑے ذوق و شوق سے شریک ہوئے۔ یہ حضرت سجادؒ کی محنت و کاوش و حسن تعلیم کا نتیجہ تھا جو ہماری طلبہ کے

---

[1] مولانا شاہ سید محمد اسمٰعیل صاحبؒ بہار شریف (پٹنہ) کے ایک ممتاز عالم اور دیندار بزرگ تھے۔ چند سال ہوئے کہ وفات پائی۔ (م ع)

دماغوں سے خواہ مخواہ یو۔ پی جانے کی ہوس دُور ہوئی۔ ورنہ بہاریوں میں اتبک بیرونِ بہار کی بڑی مانگ ہے۔ خصوصاً عربی پڑھنے والے بغیر کانپور، دہلی وغیرہ سے فراغت کیے ہوئے علمائے معتبر کی صف میں جگہ نہیں پاتے۔ ایسی صورت میں طلبۂ عربی کو فراغت تک پہنچانا یہ حضرت سجادؒ کی کرامت تھی۔

درس و تدریس میں جن اُمور کی رعایت سے طلبہ کو پوری تشفی ہو سکتی ہے، مولاناؒ اس میں کسی طرح کی کمی جائز نہ رکھتے۔ مطالب کتاب کو خوب کھول کر سامنے رکھنے کی سعی فرماتے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کس قدر گہرے مطالعہ اور توسیع معلومات کی محنت برداشت کرنیکی ضرورت ہے، پھر ایک بار کی تقریر سے تشفی نہ ہوتی تو دوبارہ سہ بارہ تقریر کرنے میں چین بجبیں نہ ہوتے، اور اگر اوقات مدرسہ میں آسودگی نہ ہوتی تو خارج وقت دینے میں کوئی دریغ نہ فرماتے تھے کہ شروح و حواشی دکھلا کر تشفی فرمانے کی زحمت گوارہ کرتے، بلکہ کتاب کے مشکل مقامات کو اہل فضل کے سامنے رکھکر تشفی کرانے میں بھی بےنفسی کا ثبوت دیتے۔ پھر طلبہ کے اسباق کا اس قدر احساس تھا کہ شہر کی آب و ہوا کی رداءت کے باعث مدرسہ ہفتہ دو ہفتہ کے لئے بند ہو جاتا تو پندرہ بیس طلبہ کو بہمسہ اپنے مکان لیے جاتے اور سب کے ناشتے کھانے کے خود کفیل ہو کر مکان ہی پر درس میں مشغول ہوتے۔ مجھ کو بھی ایک مرتبہ ایسا موقع ملا ہے اُس وقت مولاناؒ کے یہاں خوب کاشتکاری ہوتی تھی، کھانے پینے میں بڑی وسعت تھی، خدم و حشم سب ہی کچھ تھے لیکن آپ نے درس و تدریس کے شوق میں اس طرف سے توجہ ہٹالی اور آپکے بڑے بھائی مولوی احمد سجاد صاحب بھی مجذوبانہ کیفیت سے متکیف ہو کر الگ ہو گئے۔ نوکروں پر مدار رہ گیا اس واسطے کاشتکاری کی حالت زبوں ہو گئی۔ بہرحال حضرت مولاناؒ کی سعی اور محنت و

قربانی کا جو نتیجہ ہونا چاہیے ہو کر رہا' ایک طرف تو طلبہ گرویدہ ہو کر آپ ہی کے ہو رہے اور دوسری طرف خود حضرت مفکر اعظمؒ تحقیقات و معلومات کے بحرِ زخار ہو گئے۔ جس نے دیکھا ہے کہ حافظ صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم و تدریس محض ایک تبرک کی حیثیت رکھتی تھی تو اس کے لئے مولاناؒ کی اس علمی ترقی میں حیرت کی اور بھی کوئی حد نہیں رہتی' چنانچہ میں نے اپنے اس تحیر کو عرض بھی کیا' فرمایا کہ "نہیں وہاں بھی روشنی ملتی ہے۔ علاوہ اس کے میں ایک گونہ صلاحیت پیدا کر کے پہنچا تھا مولانا محمد عبدالشکور صاحب مظفر پوری (فی الحال مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ) سے سُلّم وغیرہ پڑھ کر کتاب فہمی کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی"۔ حضرت مفکر اعظمؒ تہذیب وغیرہ پڑھنے کے زمانے میں کانپور سے دیوبند تشریف لے گئے تھے' لیکن ایک بنئے سے لڑائی ہو جانے کے قصہ میں بہاری طلبہ کو جس کے سرخیل مولانا محمد عبدالشکور صاحب تھے' دیوبند کو خیرباد کہنا پڑا۔ مگر حضرت سجادؒ کو دیوبند کی یاد تازہ رہی۔ اکثر دیوبند کا ذکر فرمایا کرتے۔ انہی قلبی تاثرات نے سیاسیات کے سلسلہ میں دیوبندیوں سے ایسا ملایا کہ ایک فرد متصور کیے جانے لگے اور اکابر علمائے دیوبند نے بھی آپ کے تبحر علمی کے ساتھ ایثار و قربانی' استقلال و فکری جد و جہد کی قدر دانی کرتے ہوئے اپنے مشن کا وزیر بنا لیا بلکہ حقیقت میں جزو کل مان لیا۔ آپ ہی کے بار بار تذکرہ دیوبند نے میرے دل میں تحریک پیدا کر دی جو مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے جلسہ دستار بندی کی شرکت کے بعد عملی جامہ پہن سکی۔ شوال ۱۳۲۶ھ میں الہ آباد ہوتا ہوا بمعیت مجی جناب حافظ عبدالرحمٰن صاحب بہاری (مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ) دیوبند پہنچا' اور حضرت مولاناؒ بھی مدرسہ سبحانیہ الہ آباد تشریف

لے گئے۔ پھر وہاں سے گیا تشریف لا کر مدرسہ انوار العلوم کو زندہ کیا اور اپنے فکر و عمل سے مدرسہ کو خوب ترقی دی۔ دستار بندی کے متعدد جلسے دھوم دھام سے کرتے رہے اور ہندوستان کے مشہور علمائ مقررین و واعظین کو بلا کر تبلیغ کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ان مشغولیتوں کے باوجود مدرسہ اسلامیہ بہار شریف سے برابر تعلق قائم رہا اور قدیم ہمدردی میں کمی واقع نہ ہوئی۔ مدرسہ کا سالانہ جلسہ خصوصاً آپ کی قائم کردہ سنت کے موافق فارغین کی دستار بندی کا جلسہ جو ہوتا تھا اس موقع میں آپ تشریف لا کر جلسہ کو پُر رونق بنانے کی پوری سعی فرماتے۔ مدرسہ کے ناظم و مدرس اول بھی ان مواقع میں آپ کی شرکت کو ضروری سمجھتے۔ جلسہ کی تاریخ سے بہت پیشتر خط و کتابت کر کے وعدہ لے لیتے۔ غرض طرفین میں باہم خلوص و اعتماد تھا اور مدرسہ کی ترقی و بہبودی پیش نظر رہی۔ میں دو برس کے قریب دیوبند رہ کر واپس آیا۔ اور مدرسہ اسلامیہ میں مدرس ہو گیا۔ حضرت مولانا کی مجھ پر خاص عنایات تھیں، ان جلسوں کے فارغ اوقات کی نجی نشستوں میں قوم و ملت کی اصلاحات و ترقیات کے بارے میں باتیں ہوتی تھیں۔ خصوصاً مولویوں کے سیاسیات سے الگ ہو جانے کے باعث اسلامی حقوق کی پامالی دیکھ کر اصلاحی صورتوں پر دیر تک بحث رہتی تھی آخر جمعیۃ علمائے بہار کی تشکیل کا عزم ہوا، اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہار شریف تشریف لا کر تگ و دو شروع کی۔ مسٹر سید محمد قاسم مرحوم (متولی صغریٰ وقف اسٹیٹ بہار) کو راضی کر کے مدرسہ عزیزیہ میں جلسہ کرنے کی اجازت لی۔ اور استقبالیہ کمیٹی قائم کر کے اس ناچیز کو صدر استقبالیہ مقرر فرمایا، پھر اس کے ماتحت کارروائی شروع کی۔ تاریخ جلسہ معین کر کے علمائے بہار

کی خدمات میں دعوتی رقعے ارسال کیے، شوال ۱۳۳۶ھ میں حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین احمد قدس سرہٗ کے عرس کے موقع پر یہ جلسہ طلب کیا گیا اور مدرسہ عزیزیہ کے وسیع صحن میں شامیانے کے نیچے علماء، مدعوین اور عوام کے جلسہ میں جمعیۃ علمائے بہار کی بنیاد رکھدی گئی۔ حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی غفرلہ مع اپنے صاحبزادہ شاہ حسین میاں کے شریک تھے۔ اس میں حسین میاں سلمہ نے چند اشعار ایسے دل گداز لہجہ میں ترنم کے ساتھ پڑھے تھے جس سے مجلس میں تجودی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اور غالباً اب تک سامعین کے سامعہ میں وہ دلکش صدا گونج رہی ہوگی۔ پھر دوسرے سال پھلواری شریف میں بڑے پیمانہ پر اس کا جلسہ ہوا۔ مولانا آزاد سبحانی کو دعوت دیکر بلایا گیا۔ انہوں نے اپنی زبردست تقریر و سحر بیانی سے حاضرین میں جوش و ولولہ کی روح پھونکدی۔ جلسہ نہایت کامیاب رہا اور اس میں شک نہیں کہ اس کامیابی میں حضرت شاہ سلیمان مرحوم کا بڑا ہاتھ تھا۔

پھر جب حضرت استاذ نے امارت شرعیہ بہار کی تمہید اٹھائی تو حضرت شاہ صاحب مرحوم نے اس کی تاسیس و تعمیر میں ساتھ دیا لیکن امارت کے دوسرے دَور کے بعد خیال نے پلٹا کھایا جس کے باعث دونوں ہستیوں کے درمیان مخالفت کی خلیج حائل ہوگئی۔

۱۳۳۸ھ میں جبکہ علماء کی یہ سیاسی تحریک تو مولود ہی کی حیثیت میں تھی، میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں مدرس ہوگیا، اور جس سیاسی میدان میں مجھے کھینچکر لایا گیا تھا وہاں سے واپس ہونا پڑا۔ مگر حضرت مولانا کی مدبرانہ طبیعت نے حالات و مقتضیات وقت کا لحاظ کرکے

کبھی کبھی مجھے اپنے مشن میں حصہ لینے پر زور نہیں دیا۔ بلکہ مجھکو اسی حال پر چھوڑ کر ایسے دائرہ عمل میں داخل کرتے رہے جہاں خدمات مفوضہ سے ٹکر نہ ہو۔ اسی سال (۱۹۴۷ء) کا واقعہ ہے کہ محبی مولانا سید شاہ عبید اللہ صاحب مجھری مدرس مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی وفات سے انجمن محمدیہ ٹینہ سیٹی کی مستقل صدارت کی جگہ خالی ہو گئی تھی اسکے سالانہ جلسہ میں جو ہر سال امارت شرعیہ کی نگرانی میں منعقد ہوا کرتا ہے ناچیز کی غیر موجودگی میں صدارت کے لئے اس کا انتخاب کرا دیا گیا۔ اس انجمن کا نصب العین اصلاح و تبلیغ ہے اور میری خدمت کے مزاحم نہیں۔

غرض یہ کہ حضرت مفکر اعظمؒ فکر و عمل کے ساتھ تدبیر کے بھی مالک تھے، اپنے تدبر و عمق نگاہی سے انجام کو بھانپ لیتے تھے اور جو پرزہ جہاں کام دے سکتا تھا وہیں اس سے کام لینے کی سعی فرماتے تھے۔

حضرت استاذ محترم مفکر اعظمؒ مذہب و عمل میں حنفی تھے، لیکن تنگ نظروں کی طرح اہلسنت کے دوسرے فرقوں سے جنگ آزما نہ تھے، بلکہ فرماتے تھے کہ نماز کی مختلف صورتیں جو احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں، ایک ایک مرتبہ بھی سب پر عمل کر لینا چاہئے تاکہ کسی سنت کی برکات سے محرومی نہ رہ جائے۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت مولاناؒ کے نزدیک احادیث مختلفہ میں اختلاف نسخ نہ تھا بلکہ اختلاف اباحت یا رخصت و عزیمت کا اختلاف تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس تحقیقی مسلک کے ماتحت بہتیرے مذہبی اختلافات کا قلع قمع ہو جانا روشن ہے، مگر مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ فروعات و اجتہادیات مسائل (جن میں بڑی وسعت تھی) کو معرکۃ الآراء بنا کر لاتنازعوا کی نہی صریح اور اسی شغل میں رہ کر واعدوا کے امر قطعی کو چھوڑ بیٹھے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ سامنے ہے۔

حضرت ابوالمحاسنؒ اوائل عمر ہی میں مُرید بھی ہو چکے تھے۔ حضرت قاری سید احمد شاہجہانپوری نقشبندی قدس سرہٗ ایک متقی و متشرع بزرگ تھے۔ جن سے آپ کے خسر معظم حضرت مولانا سید وحید الحق بانی مدرسہ اسلامیہ بہار شریف رحمۃ اللہ علیہ اور بہار شریف و اطراف بہار کے بہتیرے خوش خیال حنفی مرید تھے، حضرت مولاناؒ کے بڑے بھائی صوفی احمد سجاد صاحب جو مجذوبیت کے عالم میں مست ہیں، سید قدس سرہٗ کے خاص مریدوں میں ہیں۔

حضرت مولاناؒ کا مشرب عقل و شرع کے مطابق اُن ارباب تصوف سے جُدا گانہ تھا جنھوں نے نوافل و اوراد کے سلسلہ دراز میں اُلجھ کر اجتماعی شیرازہ کو پراگندگی سے محفوظ رکھنے کی نہ صرف ذمہ داری کا احساس ضائع کر دیا بلکہ اسی طریق عزلت کو حقیقت اسلام سمجھ کر عام دعوت و تلقین اور دُعا و تسخیر کے ذریعہ وسیع کرنا شروع کر دیا۔ حضرت ابوالمحاسنؒ کو اپنی فطری صلاحیت کے ساتھ ماحول بھی ایسا ملا، جہاں نوافل و اوراد کے اشتغال شبانہ یوم، قومی و ملی خدمات اور مالی و جانی قربانیوں کے مقابل نہ صرف مرجوح بلکہ سنت کے طریق سے جدا متصور ہوتے پھر تبحر علمی و نکات فہمی کی مزید تائید۔ آخر ان سب روشنیوں میں اصل حقیقت روشن ہو گئی کہ اسلام میں عبادت کی تاکید سے کہیں زیادہ اور شدید تاکید صداقت و امانت۔ تقوی و طہارت۔ مالی و جانی قربانی کی ہے، اسی واسطے حضرت مولاناؒ عبادت کے سلسلہ میں فرائض و مؤکدات پر اکتفا کر کے شب و روز فکر و عمل اور اعلائے کلمۃ اللہ میں لگے رہے۔

بعض اعتدال پسند دوستوں نے مولاناؒ کو ان تمام خوبیوں کا حامل تسلیم کرتے ہوئے بتایا کہ ان سے

ایک بڑی غلطی ہوئی کہ امارت شرعیہ کو پارٹی الیکشن میں استعمال کر کے امارت کو صدمہ پہنچایا کیونکہ امارت ایک ہمہ گیر ادارہ ہے اس کی شان مسلمانوں کی پارٹی بندیوں کی لعنت دُور کرنا تھی نہ کہ خود ایک فریق کی حیثیت اختیار کرنا —— اس میں شک نہیں کہ ظاہر نظر میں یہ اعتراض وقیع معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک بڑا مغالطہ ہے جس کے ہمارے دوست شکار ہو گئے!

بے شک پارٹی بندیوں اور تفرقہ اندازیوں کو ختم کر کے یا کم سے کم سب پارٹیوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے وحدت قائم کرنا امارت کا نصب العین ہے لیکن ساتھ ہی اسلامی قوانین و شعائر کے احترام کو باقی رکھنا بھی امارت کا اولین فریضہ ہے۔ اور آئین شرع کو اغراض پرستوں کے ہاتھ کھلونا ہونے سے بچانا عین مقصد امارت ہے۔ اب دیکھیے کہ موجودہ حکومت نے نمایندگان عوام کو ملکی قوانین بنانے کا اختیار دے رکھا ہے مگر بدقسمتی سے مسلمانوں کا نمایندہ کونسلوں میں جا کر اسلامی آئین۔ مذہبی قوانین کے خلاف بلوں پر مہر تصدیق ثبت کر کے توہین اسلام کا مظاہرہ پیش کرتا ہے اور جب علمائے مذہب کی جمعیۃ تنبیہ کرتی ہے تو لبیک کہنے کے بجائے اس کو ٹھکرا دیتا ہے تو کیا آئین اسلام کے تحفظ کے لئے کونسلوں میں ایسے ممبران بھیجنا ضروری نہیں جو اسلامیات کے متعلق علمائے دین کے فیصلہ کو شاہراہ عمل قرار دیں؟ اور ایسے افراد کو ممبر ہونے سے روکنا فرض نہیں جو کونسلوں میں پہنچ کر بلوں کے پاس کرنے میں شریعت کا پاس نہ رکھیں؟ اب اگر اس سلسلہ میں پارٹی بندی لازم آتی ہے تو امارت اس کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ مطلق العنان امیدوار ہے اس واسطے پارٹی بندیوں کے الزام و جرم سے امارت کا دامن بالکل پاک ہے۔

امسال حضرت نائب امیر شریعت کو جمعیۃ علمائے ہند نے ناظم اعلیٰ مقرر کیا تھا اور اگرچہ آپ کی ذات اس عہدہ سے پیشتر بھی جمعیۃ کے لئے روح رواں تھی۔ لیکن جبکہ ارکان جمعیۃ کے اصرار سے اس عہدۂ نظامت کی باگ ہاتھ میں لی تو ایک جدید اسکیم کے ماتحت نئے اسلوب سے جمعیۃ کے چلانے کا کام شروع کر دیا تھا کہ ایسے نازک وقت میں ایثار وعزم کا یہ پیکر مجسم ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گیا۔

قوم وملت کی اس سے زیادہ کیا بدنصیبی ہو سکتی ہے مگر مشیت ایزدی میں صبر ہی واحد علاج ہے۔ آپ نو روز بخار میں علیل رہ کر ۲ شوال ۱۳۵۹ھ کو دوشنبہ کے دن شام کے وقت رفیق اعلیٰ سے جا ملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ آپ کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے، اور اپنے مقام قرب کے انعامات سے نوازے۔ آمین

مولانا الٰہ آباد میں

(از جناب مولوی حکیم حافظ قاری یوسف حسن خان صاحب - بہار شریف)

۱۵ر جنوری سنہ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۶ر محرم الحرام سنہ ۱۳۲۹ھ کو والد ماجد مولوی الٰہی بخش خان صاحبؒ[1] نے حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحبؒ کو جبکہ وہ مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں مدرس تھے اس مضمون کا جوابی خط لکھا کہ "ان دنوں محمد یوسف سلمہ کی تعلیم مستقل طور پر نہیں ہو رہی ہے اور ان کو آپ سے پڑھنے کا بیحد شوق ہے اس لئے میری خواہش ہے کہ آپ کے پاس بھیجدوں۔ سفر میں رہنے سے ان کو تجربات حاصل ہونگے معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔" اس کے جواب میں ۲۲ر جنوری سنہ ۱۹۱۱ء مطابق ۲۳ر محرم الحرام سنہ ۱۳۲۹ھ کو مولاناؒ نے اپنے دست مبارک سے والد ماجد علیہ الرحمہ کو جو جواب لکھا تھا وہ حسب ذیل ہے :-

جناب مولانا المعظم والافخم مدعنا تکم بعد سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ اعزاز نامہ صادر ہوا مسطور فیہ سے واقف ہوا۔ اس وقت ان کے مناسب حال مفصلہ ذیل کتابیں ہو رہی ہیں۔ شرح وقایہ ہر دو جلد - جلالین شریف - مشکوٰۃ شریف - مقامات حریری - قطبی اور یہ سب بالکل

---

[1] مولانا الٰہی بخش خان صاحب بڑاکری بہاری اپنے وقت کے ایک ممتاز اہلحدیث عالم تھے۔ بیسیوں کتابیں ان سے یادگار ہیں اور چھپکر مقبول ہو چکی ہیں۔ بڑاکر، بہار شریف سے وگھن اور مولانا مرحوم کے وطن پنہسہ سے تین چار میل کے

ابتدا ہی میں ہو رہی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو روانہ فرما دیں۔ کھانے کا انتظام ہو جائیگا۔ مگر میرے خیال میں تو آپ کے سامنے ان کی تعلیم باحسن وجوہ ہوتی۔ مگر خیر میں آپ کے ارشاد کو ہرگز اٹھا نہیں سکتا۔ فقط والسلام۔ جناب شاہ منظر حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض فرما دیجیگا۔

ناچیز ابو المحاسن محمد سجاد عفی عنہ

میں اُس وقت ۱۵ سال کا تھا، جناب حافظ عبد اللہ صاحب پیش امام جامع مسجد بہار شریف کی توجہ سے حفظ سے فارغ ہو چکا تھا۔ خان بہادر جناب مولانا محمد مبارک کریم صاحب مدظلہٗ العالی (ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز صوبہ بہار اڑلیسہ) سے مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مرقاۃ، شرح تہذیب اور جناب مولانا اصغر حسین صاحب مدظلہٗ (حال وائس پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ) سے شرح وقایہ و ابو داؤد پڑھ رہا تھا۔ مجھ کو سفر کا بیحد شوق تھا، جب والد ماجد علیہ الرحمۃ سے دلی خواہش کا اظہار کیا تو اس وقت سردی بہت زیادہ پڑ رہی تھی، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خط آنے پر بھی مجھے روک رکھا، مولانا کی شہرت سُن کر ان کی خدمت میں حاضری کا شوق بہت بڑھ گیا تھا۔ جب برابر باوجود سردی کے 'میرا اصرار ہوا تو والد ماجد نے اپنے خط میں یہ جملہ تحریر فرمایا کہ ''در موسم بہار سفر از بہار پُر بہار خواہد شد'' - بالآخر سہ شنبہ ۷ فروری ۱۳۲۹ھ کو مولانا کی خدمت میں الہ آباد پہنچا۔ مولانا میرے رہنے اور کھانے کا انتظام اپنے ساتھ رکھکر مندرجہ بالا کتابیں پڑھانے لگے۔ اُن دنوں ۲۰ - ۲۵ بہاری طلبہ مولانا سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مجھے اس پر ناز ہے کہ میں نے یہ سب کتابیں مولانا ہی سے پڑھیں۔ سارے طلبہ مولانا کے عاشق زار تھے۔ مولانا طلبہ کو بلا ناغہ ہر پنجشنبہ کے روز تقریر

ومناظرہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ چونکہ میں مدرسہ کا باضابطہ طالب العلم نہ تھا اور فقط مولاناؒ کی خدمت کو ذریعہ سعادت سمجھتا تھا۔ اس لئے فن تجوید کے لئے میرا نظم مدرسہ احیاء العلوم میں استاذ القراء جناب حافظ قاری عبدالرحمٰن مہاجر مکیؒ سے فرما دیا تھا۔ مجھ میں نے قرأت وتجوید حاصل کی وہ صرف قاری صاحبؒ کا فیض ہے۔

شروع رجب ۱۳۳۱ھ میں مولانا مرحوم کو چند ناگزیر واقعات کی بنا پر الہ آباد چھوڑنا پڑا۔ مولانا علیہ الرحمۃ جس وقت الہ آباد چھوڑ رہے تھے۔ شہر کے سامنے عمادین ورؤسا اسٹیشن پر آکر رو رہے تھے اور فرماتے تھے کہ الہ آباد سے آج فقہ رخصت ہو رہا ہے۔ الہ آباد میں میرے قیام کے زمانہ میں ساری دنیا کی صنعتوں کی نمائش ہو رہی تھی۔ مولاناؒ اپنے ساتھ شفقت کے باعث مجھے لے گئے اور ساری چیزوں کو دکھا دکھا کر مجھے سمجھایا۔ اسی زمانہ کا ایک لطیفہ ہے کہ ایک بہت بڑا آریہ مناظر مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے آیا اور کہنے لگا کہ مولانا اس میں تو کوئی مضائقہ نہیں کہ مسلمان گائے کی قربانی ترک کر دیں اور ہندو مسلمانوں کو بکرا و بکری قربانی کا انتظام کر دیں۔ مولاناؒ نے فوراً برجستہ فرمایا کہ "میاں ہم لوگوں کو جانور کے بالوں کی تعداد کے مطابق ثواب ملتا ہے۔ اتنا بال اور جانوروں میں کہاں؟" وہ لاجواب ہو گیا اور کچھ دیر خاموش ہو کر رخصت کی اجازت چاہی اور چلا گیا۔ دوران قیام میں ایک شیعہ رئیس زادہ مولاناؒ سے ریاضی پڑھنے آتا تھا۔ وہ سارے ہندوستان کی خاک چھان چکا تھا لیکن کہیں اس کی تشفی نہیں ہوئی آخر میں وہ مولاناؒ کے طرز تعلیم پر فریفتہ ہو گیا اور باوجود رئیس زادہ ہونے کے برابر مولاناؒ ہی کی خدمت میں قیام گاہ پر تعلیم حاصل کرتا تھا اور اس کے والدین مولاناؒ کو پچیس روپے دیا کرتے تھے۔ مولانا علیہ الرحمۃ

اس سے روپے لیکر طلبہ کی ذات میں بھی کا کل خرچ کر دیا کرتے اور اپنے لئے ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے۔

جس وقت مولاناؒ مدرسہ سبحانیہ سے جدا ہونے لگے۔ ۱۵۔۲۰ طلبہ ساتھ ہو گئے۔ مولاناؒ نے سب کو اپنی جیب خاص سے سفر خرچ عنایت فرمایا اور گیا آکر مدرسہ انوار العلوم کی بنا ڈالی۔ میں وہاں سے مدرسہ احیاء العلوم جاکر صرف قاری صاحب سے قرأت پڑھتا رہا اور ۱۴ راگست ۱۹۱۱ء مطابق ۱۸ رشعبان ۱۳۲۹ھ کو وطن واپس چلا آیا۔ پھر مولانا مرحوم کا گیا مدرسہ انوار العلوم سے طلبی کا خط مورخہ ۱۳ رشوال ۱۳۲۹ھ کو گھر پر ملا لیکن افسوس میں نہ پہنچ سکا۔ مکتوب گرامی حسب ذیل ہے:۔

عزیزی مولوی حافظ یوسف سلمہٗ دعائے خیر میں بخیر ہوں اور صحت آں عزیز کی مطلوب۔ مدرسہ کی حالت جو کچھ ہے وہ یہاں آنے سے معلوم ہوگی۔ مجملاً یوں سمجھ لو کہ بالفعل ابھی تک سبق شروع نہیں ہوا ہے کیونکہ آں عزیز کا انتظار ہے۔ لہذا آں عزیز کو تحریر کرتا ہوں کہ بمجرد خط کو دیکھتے ہوئے چلے آؤ کیونکہ جناب حافظ صاحب (مولانا حافظ عبد الکافی دعاحبؒ الہ آبادی) وغیرہ تشریف لانے والے ہیں جس میں جلسۂ افتتاحی بھی ہونے کا خیال ہے۔ خلاصہ یہ کہ جہاں تک ممکن ہو بہت جلد چلے آؤ۔ زیادہ والدعا۔ ابو المحاسن محمد سجاد عفی عنہ از مدرسہ انوار العلوم متصل ظفر منزل

مورخہ ۱۳ رشوال المکرم ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء

مولاناؒ کی شفقت و عنایت کا حال یہ تھا کہ بہار شریف جب تشریف لاتے مجھے قدمبوسی کا شرف ضرور مرحمت فرماتے۔ مجھ ناچیز سے کبھی کبھی کچھ دینی خدمت بھی لیتے تھے جس کی شہادت یہ دو خطوط[۱]

۱؎ چند برس ہوئے بہار شریف میں المدرسۃ شرعیہ کے ماتحت جمعیۃ العلماء قائم کی گئی تھی جس کے صدر و الدعا برؒ مولانا

دیے جاتے ہیں۔ سنہ رواں کے ماہ رجب میں مولاناؒ نے پٹنہ میں مجھے شرف زیارت بخشا اور مدرسہ اسلامیہ بہار شریف کے متعلق پُر درد لہجہ میں فرمایا کہ لوگ ایسے قدیمی دینی فیض رساں درسگاہ کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ دو تین ماہ خاص بہار شریف جا کر اقامت اختیار کروں اور اس کا باضابطہ مالی انتظام درست کر دوں۔ مگر افسوس کہ یہ حسرت مولاناؒ کی پوری نہ ہونے پائی اور بے وقت انتقال نے مدرسہ مذکور کی اصلاح کی صورت نہ پیدا ہونے دی۔[۱]

---

[۱] اب آخری اطلاع یہ ہے کہ حریفوں کو صرف مولاناؒ کی وفات کا انتظار تھا، اور ان کے انتقال کے کچھ ہی دنوں بعد، یہ مدرسہ گویا ختم کر دیا گیا۔ اب اس کی صورت ایک معمولی مکتب کی رہ گئی ہے۔

وائے برحال ما!

حاشیہ بقیہ ص ۴۳

۵ حکیم عبداللہ کبیر صاحب مدظلہ تھے، اور نظامت حکیم صاحب کو تفویض کی گئی تھی۔ کچھ دنوں سرگرمی سے کام ہوتا رہا۔ اس سلسلہ کے تمام خطوط حکیم صاحب نے عنایت فرمائے ہیں جو سیرت کی تدوین میں کام آئیں گے۔ م، ع

محاسنِ ابوالمحاسن

(از حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی، امتع اللہ المسلمین بطول بقائہ)

مرنا اور جینا، دنیا کے روزانہ کے کاروبار ہیں۔ کون نہیں مرا اور کون نہیں مریگا، آج وہ کل ہماری باری ہے، اس پر بھی عزیزوں اور دوستوں کی ہر موت پر رونے والے روتے ہیں، ان کے دائمی فراق پر ماتم اور فریاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک خوبیوں کو یاد کر کرکے ان کا نوحہ پڑھتے ہیں۔ عام حالت یہی ہے لیکن بعض موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کی خبر سن کر زبان بند ہوجاتی ہے آنسو سوکھ جاتے ہیں، دل کی حرکت بڑھ جانے کے بجائے گھٹ جاتی ہے، اندر ہی اندر گھٹن محسوس ہوتی ہے مگر جی نہیں چاہتا کہ کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکالیے اور آنسو بہا کر غم ہلکا کیجیے۔ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم کے سانحہ کا مجھ پر بالکل یہی اثر ہوا۔ دن بیت گئے، ہفتے گذر گئے، مہینہ پر ایک اور مہینہ گذرا مگر زبان نہ کھلی اور دل کی امانت قلم کے سپرد نہ ہوسکی۔ عزیزوں اور دوستوں کو تعجب ہے کہ میرا قلم جو احباب کی سوگواری میں ہمیشہ اشکبار رہتا ہے اس دفعہ اپنے فرض کو کیوں بھولا ہے۔ مگر یہ کیسے بتاؤں کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع غم سے مجھے کیوں چپکی لگ گئی، ہر چند زبان خاموش تھی لیکن کئی دن تک سوتے جاگتے مرحوم کی صورت آنکھوں میں پھرتی اور خواب میں نظر آتی رہی۔

تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا مایرضی ربنا وانا بفراقک لمحزونون۔

اکثر اکابر اور مشاہیر کی ملاقاتیں خاص حالات کی بنا پر یاد رہتی ہیں۔ اور یہ بھی یاد رہتا ہے کہ

یہ ملاقاتیں کب ہوئیں، کہاں ہوئیں اور کیسے ہوئیں، لیکن اگر محبت کی عمر، یاد کی عمر سے زیادہ ہو تو اس کو ازلی ملاقات کہہ سکتے ہیں۔ الارواح جنودٌ مجنّدۃ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف۔ اسی اصول کی بنا پر مجھے یاد نہیں کہ دنیا میں میری اُن کی ملاقات کب ہوئی، کہاں ہوئی اور کیونکر ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قربِ مکانی، اتحادِ زمانی اور شدتِ ہم ذوقی کی بنا پر، ہم ایک دوسرے سے اتنے آشنا تھے کہ پہلی ملاقات ان روابط کی شدید پر کوئی نیا اضافہ نہ کر سکی۔

اس آخری زمانہ میں دو سال میں ایک دفعہ میرے ایام قیام وطن میں کوئی نہ کوئی کام نکال کر دیسنہ ضرور تشریف لاتے اور میری عزت بڑھاتے اور ان کے ملنے والوں میں کون تھا جس کی عزت اپنی محبت سے وہ نہ بڑھاتے۔ ان کی تواضع میں بلندی، سادگی میں بناؤ اور خاموشی میں گویائی تھی۔ وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے، مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے، سراپا حال تھے، کہتے کم کرتے زیادہ تھے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ "راہ" اور "منزل" کے فرق کو کبھی فراموش نہ کیا۔

انہوں نے راہ میں ہمراہیوں کے لطف کلام میں پھنس کر منزل سے ہٹنا کبھی گوارہ نہیں کیا، وہ وطن کی آزادی اور احکام مذہبی کی پیروی کے درمیان التباس اور تصادم سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔ جذبۂ آزادی کی پوری قوت کے باوجود انہوں نے کانگریس یا کانگریسی حکومت کے غلط قدم اٹھانے پر کبھی بزدلانہ یا صلح پسندانہ درگذر سے کام نہیں لیا۔

مرحوم کی زندگی کے سوانح لکھنے والے لکھیں گے مگر عقیدت کی چند سطریں ان کے ایک دیرینہ

نیاز مند کی طرف سے یادگار اوراق رہیں تو محسن کے شکریہ کا بار اس کے کندھے سے کم ہو۔

وطن

صوبہ بہار میں قصبہ بہار اور گیا کے درمیان کا علاقہ ہندوؤں کے عہد میں بودھوں اور جینیوں کی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے۔ اسی راستہ میں چند میل آگے بڑھ کر بودھوں کی مشہور درسگاہ نالندہ کے آثار اور کھنڈر ہیں، اسی سے ملا ہوا پہتسا نام مسلمانوں کا ایک گاؤں ہے، جہاں سادات کے کچھ گھرانے آباد ہیں، انہیں میں سے ایک گھر میں مولانا سجادؒ کی ولادت ہوئی۔

تعلیم و تربیت

تیرہویں صدی کے شروع میں صوبہ بہار میں مولانا وحید الحق صاحب استھانوی بہاری کے دم قدم سے علم کو کوئی رونق حاصل ہوئی۔ قصبہ بہار میں انہوں نے مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور بہت سے عزیزوں کی تربیت کی، ان میں سے ایک مولانا سجادؒ بھی تھے۔ عربی کی ابتدائی تعلیم انہی کے زیر سایہ ہوئی اور ان کی پہلی شادی بھی انہی کی دختر نیک اختر سے ہوئی تھی۔

آخری تعلیم الہ آباد کے مدرسہ سبحانیہ میں مولانا عبد الکافی صاحب الہ آبادی کے درس میں ہوئی اور وہیں سنہ ۱۳۱۶ھ سے سنہ ۱۳۲۲ھ تک رہ کر سند فراغ حاصل کیا۔

ابتدائی کام

تعلیم سے فارغ ہو کر مدرسی کی خدمت انجام دی۔ اس عرصہ میں کبھی وہ مدرسہ اسلامیہ بہار میں رہے اور کبھی مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں۔ سنہ ۱۳۲۹ھ تک یعنی سات برس تک وہ اس فرض کو انجام دیتے رہے۔ سنہ ۱۳۲۹ھ میں گیا میں مدرسہ انوار العلوم کی بنیاد ڈالی۔ مولانا عبد الوہاب[1] منطقی بہاری بھی شریک کار تھے۔ یہ بات مجھے یوں یاد رہی کہ شاید سنہ ۱۹۰۸ء یا سنہ ۱۹۰۹ء تھا کہ مدرسہ مذکور کے ایک جلسہ سالانہ میں مولانا عبد الوہاب صاحب کی دعوت پر مولانا شبلی نعمانی مرحوم اور مولانا عبد الحق

[1] مولانا عبد الوہاب اس وقت انوار العلوم کو بند کر کے کلکتہ جا چکے تھے۔

صاحب حقانی دہلوی مرحوم شریک جلسہ ہوئے تھے اور تقریریں کی تھیں۔

مولانا سجاد صاحبؒ مدرسہ انوار العلوم کا یہ جلسہ سال بسال کیا کرتے تھے۔ اور اس میں علمار کو بلاتے تھے اور ان سے تقریریں کراتے تھے۔ میرا خیال ہے اکثر علمار سے ان کی ملاقاتوں کا آغاز انہی جلسوں میں ہوا۔ مجھے بھی ایک دو دفعہ ان جلسوں میں حاضری کا اتفاق ہوا۔

سیاسیات کا ذوق

ان کو سیاسیات کا ذوق جنگ عظیم میں ترکی کی شکست اور ممالک اسلامیہ کی پراگندگی سے ہوا۔ وہ اس وقت الٰہ آباد میں تھے، ان کے ایک انگریزی داں شاگرد، ان سے عربی پڑھنے آتے تھے وہ اپنے ساتھ اردو اور انگریزی اخبارات لاتے تھے اور مولاناؒ کو پڑھ پڑھ کر سناتے تھے۔ یہ آگ روز بروز بھڑکتی چلی گئی۔ مولانا ابوالکلام کے الہلال کی تحریک نے بنگال کے قرب کے سبب سے بہار پر پورا اثر کیا تھا۔ اور بہت سے علمار نے ان کی اس تحریک پر لبیک کہا۔ ان میں سے مولانا سجادؒ کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔

رانچی کی اسیری کے زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے ہم خیال اور کارفرما علمار کی تلاش و تفتیش کا کام ایک مخلص کے سپرد کیا تھا، انہوں نے جن علمار کا نشان دیا ان میں سے ایک مولانا سجادؒ بھی تھے جو اس وقت انوار العلوم گیا کی مسند درس پر تھے۔

سنہ ۱۹۱۹ء سے تحریک خلافت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مولاناؒ کا ذوق سیاست بھی بڑھتا گیا سنہ ۱۹۲۰ء میں مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی کی تحریک اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی تائید سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں جب جمعیۃ العلمار دہلی کی بنیاد پڑی

تو موصوف اس کے لبیک کہنے والوں میں سب سے اول تھے' اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کتنے رفیق سفر تھک تھک کر اپنی جگہ پر بیٹھ رہے تھے۔ مگر انہی کی ایک ہستی تھی جو آخر تک جمعیۃ کے ساتھ لگی رہی' بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انہیں کی روح تھی جو اس کے قالب میں جلوہ گر ہوتی رہی۔

بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں۔

۱۹۱۸ء میں معارف میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اصلاحات کے سلسلہ میں اس کو پیش کیا گیا۔ پھر یورپ سے واپسی کے بعد چاہا کہ اس کو تمام ہندوستان کا مسئلہ بنایا جائے مگر اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علم برداروں نے اس کو چلنے نہ دیا' مگر بہار میں مولانا ابوالکلام صاحب کی تحریک پر مولانا سجاد صاحبؒ کی قوت عمل نے اس کو وجود کا قالب بخش دیا۔

مولانا سجاد مرحوم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ علماء سیاسیات میں بھی قوم کی رہبری کا فرض انجام دیں مسلمانوں میں دینی تنظیم قائم ہو جائے جس کے تحت میں ان کے تمام تبلیغی۔ مذہبی و تعلیمی و تمدنی کام انجام پائیں' دار القضاء قائم ہو کر مسلمانوں کے ہر قسم کے مقدمات و معاملات تصفیہ پائیں مسلمانوں کا بیت المال قائم ہو جہاں مسلمانوں کے صدقات و تبرات زکوٰۃ کی ساری رقمیں اکٹھی ہو کر ضروریات میں خرچ ہوں اور مستحقین میں تقسیم ہوں۔ مولانا نے عمر کے اخیر بیس برس انہی کاموں میں صرف کئے' اور حق یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کی مالی بے بضاعتی مددگاروں کی کمی، رفقاء کی نامساعدت' اور حالات کی مخالفت کے باوجود جو کچھ کر دکھایا وہ

ان کی حیرت انگیز قوتِ عمل کا ثبوت ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہے۔

بہار کی تنہا دولت

ان کا وجود گو سارے ملک کے لئے پیام رحمت تھا مگر حقیقت یہ ہے صوبہ بہار کی تنہا دولت وہی تھے۔ اس صوبے میں جو کچھ تبلیغی، تنظیمی، سیاسی اور مذہبی تحریکات کی چہل پہل تھی وہ کل انہی کی ذات سے تھی، وہی ایک چراغ تھا، جس سے سارا گھر روشن تھا۔ وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے۔ وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا۔ مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا۔

علم و فضل

فلسفہ تاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم اور عمل کم یکجا ہوتے ہیں۔ لیکن انہی کمیاب مثالوں میں مولانا سجادؒ کی ذات تھی، وہ اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور متبحر عالم تھے خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، جزئیات فقہ اور خصوصًا ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے، ان کی نظر میں تھا۔ امارت شرعیہ کے تعلق سے اقتصادی و مالی و سیاسی مسائل پر ان کو عبور کامل تھا۔ زکوٰۃ و خراج و قضا و امامت و ولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی۔ ہر چند کہ سالہا سال سے درس و تدریس و مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا مگر جب گفتگو کی گئی ان کا علم تازہ نظر آیا۔

ان کا علم محض کتابی نہ تھا بلکہ آفاقی بھی تھا، معاملات کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کو بارہا بڑے معاملات اور مقدمات میں ثالث بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تعجب ہوا ہے کہ کیونکر فریقین کو وہ اپنے فیصلہ پر راضی کر لیتے تھے اور اسی لئے لوگ اپنے بڑے بڑے کام بے تکلف ان کے ہاتھ میں دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے پاس

اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عطیہ فکرِ رسا اور رائے صائب تھی۔ مسائل و حوادث میں ان کی نظر بہت دور پہنچ جاتی تھی، وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے تھے، حریف کی چالوں کی تہ تک پہنچ جاتے تھے، باوجود تواضع و خاکساری کے اپنی رائے پر پوری قوت کے ساتھ جمتے تھے۔ اور محض ہٹ اور ضد سے نہیں بلکہ دلائل کی قوت اور مصالح کی طاقت سے وہ دوسروں کو منوانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

اخلاق

وہ بیحد خاکسار اور متواضع تھے۔ کبھی کوئی اچھا کپڑا انہوں نے نہیں پہنا۔ کبھی کوئی قیمتی چیز ان کے پاس نہیں دیکھی۔ کھدر کا صافہ، کھدر کا لمبا کرتہ، کھدر کی صدری، پاؤں میں معمولی دیسی جوتے اور ہاتھ میں ایک لمبا عصا۔ یہ ان کی وضع تھی، مگر وہ اپنی سادہ اور معمولی وضع کے ساتھ بڑے بڑے جلسوں اور بڑے بڑے مجمعوں میں بے تکلف جاتے تھے اور اپنا لوہا منوا لیتے تھے۔ جوہر پہچاننے والے بھی تلوار کی کاٹ دیکھتے تھے، غلاف کی خوبصورتی نہیں۔

ہر شخص کی مصیبت میں ہر وقت کام آتے تھے اور ہر ایک کی سفارش میں ہر وقت سینہ سپر ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو جاہ و مرتبہ بھی عنایت فرمایا۔ انہوں نے خود اپنی پارٹی کی وزارت بھی بنائی اور بادشاہ گر نہیں تو وزیر گر بنے۔ کانگریس حکومت کے زمانہ میں بھی ان کو اچھا اقتدار حاصل رہا، مگر خدا گواہ کہ وہ اس اثر و اقتدار کو اپنی ذات کے لئے کبھی کام میں نہیں لائے، جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے لئے۔

ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، غربت اور عسرت کی زندگی تھی۔ گھر کے خوشحال نہ تھے۔ امارت سے معاوضہ بہت قلیل لیتے تھے، سفر معمولی سواریوں اور معمولی درجوں میں کرتے تھے، اور اسی

حال میں پورب سے پچھم اور پچھم سے پورب، اور اتر سے دکھن، اور دکھن سے اُتر دوڑتے رہتے تھے، ان کا دن کہیں گذرتا تھا اور رات کہیں مسلمانوں کی سلامتی اور تنظیم کی ایک دھن تھی کہ اُن کو دن رات چکر میں رکھتی تھی، کہیں قربانی کا جھگڑا ہو مسلمانوں پر مقدمہ ہو۔ کہیں سیلاب آئے، کہیں آگ لگے کہیں بلوہ مسلمانوں کا تنازعہ ہو وہ ہر جگہ خود پہنچ جاتے تھے۔ معاملہ کا پتہ لگاتے تھے مظلوموں کی مدد کرتے تھے، ان کے لیے چندہ کرتے تھے جہاں سے ہو سکتا وہ ان کو لا کر دیتے تھے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے،

بہار میں زلزلہ کے زمانہ میں انھوں نے جس تندہی سے کام کیا اور ایک ایک گاؤں میں جاکر جس طرح بے گھروں کو اور بے خانمانوں کو مدد دی، وہ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے جس کا صلہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ سے ان کو عنایت فرمایا ہوگا۔

لیڈروں اور قومی کارکنوں کے پاس عام طور سے ان کے اثر کے ذریعے تین ہیں، یا دولت ہے یا حسن تقریر ہے یا زور قلم ہے۔ مرحوم ان تینوں دولتوں سے محروم تھے، وہ غریب تھے اور غریبوں ہی میں زندگی بسر کی۔ زبان میں لکنت تھی جس کے سبب سے وہ بولنے پر قادر نہ تھے اور اسی لیے وہ تقریر بہت کم کرتے تھے۔ اور ان کے قلم میں وہ زور بھی نہ تھا، جو آجکل کی انشاپردازی کا کمال ہے، تاہم ان سب کا بدل ان کے پاس ان کا ایک اخلاص تھا جو اُن کی ہر کمی کو پورا کردیتا تھا عجب نہیں کہ زبان اور قلم کا عجز ہی تھا جو ان کی قوت عملی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ کے خطبہ میں ان کی نسبت یہ الفاظ نکلے تھے۔ جو پہلے مدح

تھی۔ اب مرثیہ ہے۔

"۱۳۴۳ھ کے اجلاس خاص مرادآباد کے موقعہ پر بھی مجھے یہ عزت عطا ہوئی تھی، مگر عین وقت پر وفد حجدہ کی شرکت نے انکار پر مجبور کیا۔ اور میں خوش ہوں کہ اس کی بدولت ایک خاموش ہستی بولی اور ایک بے زبان نے زبان کے جوہر دکھائے اور ایک ہمہ تن سوز وگداز نے کاغذ کے صفحوں پر اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرے"۔

یہ بھی مولاناؒ ہی کی قوت جاذبہ تھی جو مختلف الخیال علماء اور مختلف الرائے سیاسی رہنماؤں اور قومی کارکنوں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کئے اور ایک شیرازہ میں باندھے ہوئے تھی۔

شاید بہت کم لوگوں کو علم ہو کہ مولاناؒ کی خانگی زندگی غمگین تھی، ان کے بڑے بھائی مجذوب تھے، ان کی بیوی معذور و مختل تھیں، ان کا بڑا لڑکا جو پڑھ لکھ کر فاضل اور گھر کا کام سنبھالنے کے قابل ہوا عین اس وقت کہ اس کے نکاح میں چند روز باقی تھے باپ نے دائمی جدائی کا داغ اٹھایا اور یہ سننے کے قابل ہے کہ وہ لڑکا مرض الموت میں تھا کہ مسلمانوں کی ایک ضرورت ایسی سامنے آئی کہ باپ بیمار بیٹے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو گیا۔ واپس آیا تو جوان بیٹا دم توڑ رہا تھا۔

ان کی اپنی زندگی بھی دین و ملت ہی کے نذر ہوئی، ترہٹ کے دور افتادہ علاقہ میں جہاں کہ ملیریا کے ڈر سے ادھر کے لوگ ادھر جانا موت کے منہ میں جانا سمجھتے ہیں، یہ مرد خدا اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر سال میں کئی کئی بار جاتا تھا اور کئی کئی دن وہاں رہتا تھا۔ آخری سفر بھی وہیں

ہوا اور وہیں سے ملیریا کی سخت بیماری اپنے ساتھ لایا اور اسی حال میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

جانے والے تیری رُوح کو سلام! جب تو زندہ تھا تو تیری قوم نے تیری قدر نہ پہچانی! اب تو عالم ابد میں ہے۔ میرے کان غیب سے تیری زبان مجاز سے یہ آواز سنتے ہیں۔

یٰلیت قومی یعلمُونَ بِمَا غَفَرَلِی رَبِّیْ	اے کاش کہ میری قوم جانتی کہ خدا نے مجھے بخشا اور
وجَعَلَنِی مِنَ المُکرمِینَ (یٰسین)	مجھے ان میں داخل کیا جن پر اس کا کرم ہوا۔

آنسو کے چند قطرے!

(از جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب ام۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی' بالقابہ سابق وزیر تعلیم بہار)

میں مہینوں سے بیمار پڑا ہوں' مولانا سجاد مرحوم کے انتقال نے اس بیماری کی حالت میں میرے دل و دماغ پر جو اثر کیا ہے' اس کا اظہار مشکل ہے' میری آنکھوں کے سامنے ایک اندھیرا چھا گیا ہے' دل و دماغ قابو میں نہیں' اس کا خواب و خیال بھی نہ تھا کہ مولاناؒ اس قدر جلد اور قبل از وقت لوغ مفارقت دے جائیں گے۔

آپ نے محاسن سجاد کے لئے مجھ سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے' لیکن میں کیا لکھوں؟ اپنی دماغی و دلی بے چینی کا اظہار کیا کروں' اور کیونکر کروں؟ مولاناؒ کے محاسن کوئی دو چار ہوں تو گنائے جائیں' وقت اور صحت ساتھ دے' تو شاید کبھی اپنے تاثرات قلمبند کر سکوں' اس وقت تو رہ رہ کر یہی خیال آتا ہے کہ بہار ایک بہت بڑے مخلص اور بہت بڑے کام کرنے والے سے خالی ہو گیا۔ ہمارا صوبہ اس حادثہ پر جس قدر ماتم اور واویلا کرے' وہ تھوڑا ہے۔

گذشتہ بیس برس سے جو انتھک اور پُر خلوص خدمت مسلمانوں کی اور ملک کی انہوں نے کی' اس کا احساس تو مسلمانوں کو نہیں' لیکن اس کا اجر خدا دے گا' ایسا جانباز مجاہد جس نے فلفے کر کے قوم و ملک کی خدمت انجام دی۔ جو جان کو جان اور مال کو مال نہ سمجھا جس نے اپنا گھر بار سب کچھ قوم کی راہ میں لٹا دیا' جوان سال' ہونہار بیٹے کی خطرناک علالت اور پھر موت

بھی جسے فرعون سے غافل نہ کرسکی، جس نے اللہ کے راستہ میں اپنوں کی گالیاں اور غیروں کے طعنے ہنسی خوشی برداشت کیے، ایسے جانباز مجاہد اور ہمہ تن سوز خادم ملت کی یاد جس قدر تازہ رکھی جاسکے، غنیمت ہے، اور اس کی یاد میں نذر و عقیدت کے جس قدر پھول چڑھائے جاسکیں چڑھائے جائیں، حق تو یہ ہے کہ ان کی خدمات کا حق ادا کرنا بہت مشکل ہے۔

میں عرصہ سے جانتا تھا کہ ان کی زندگی حد درجہ عسرت سے گذرتی ہے، لیکن انتہائی گہرے تعلقات کے باوجود کبھی لب کشائی کی جرأت نہ ہوئی، ان کی خودداری کچھ پوچھنے کا موقع نہ دیتی تھی، ابھی چند مہینے ہوئے، مجھے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ نہایت عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، بلکہ گھر میں فاقہ تک کی نوبت آجاتی ہے، اس پر میرا دل تڑپ کر رہ گیا، ضبط نہ ہوا، تو دریافت کیا، وہ مسکرا کر خاموش رہے، جانباز مجاہد ایسے ہوتے ہیں، مگر افسوس! ہماری قوم کو کیا قدر اور کیا پروا؟ اب جب نظر دوڑاتا ہوں، تو صوبہ بہار کو ہر طرف خالی پاتا ہوں۔

ایسا بے لوث خادم قوم آسانی سے نہیں پیدا ہوا کرتا، مسلمانوں کو خود اپنی حالت کی خبر نہیں، جیسے افراد کی بدقسمتی ہوا کرتی ہے، ویسے ہی قوموں کی بھی بدقسمتی ہوتی ہے، اور اس سے زیادہ کسی قوم کی کیا بدقسمتی ہوسکتی ہے کہ اس میں سے ایسے مخلص، جانباز مجاہد اٹھتے چلے جائیں۔

مولاناؒ، عام علماء کی طرح محض ایک صاحب درس عالم نہیں تھے، تدبر اور ملکی مسئلوں کے فہم و گرفت میں، وہ کسی بڑے سے بڑے سیاسی مدبر سے کم نہیں تھے، اور تو اور خالص قانونی اور دستوری موشگافیوں میں بھی ان کا دماغ اس طرح کام کرتا تھا، جیسے کسی معمولی فقہی مسئلہ کے

سلجھانے میں۔

مجھے وقف بل کے سلسلہ میں ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے کہ بعض دفعات میں جہاں الجھاؤ پیدا ہوا ہے اور سلیکٹ کمیٹی کے سرکاری وغیر سرکاری ممبر ہار مان چکے ہیں، مولانا کے قانونی دماغ نے مسئلہ کے سمجھنے اور سمجھانے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی اور جہاں کسی تجویز یا ترمیم کی پیچیدگیاں پیش کی گئیں، ان کے ناخن تدبیر نے الجھی ہوئی گتھیاں فوراً سلجھا دیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کا دماغ اس کے لئے پہلے سے تیار ہے۔

وہ کسی مسئلہ پر انفرادی حیثیت سے غور نہیں کرتے، ان کے سامنے ایک مرکب مجموعہ (COM-POSITE WHOLE) ہوتا تھا، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے پرجوش سپاہی اور جرنیل تھے لیکن ساتھ ساتھ اسلامی حقوق نہیں بلکہ پورے اسلامی نظام معیشت، اور اسلامی قانون کے نفاذ کے بھی وہ سرگرم داعی تھے۔ اور ان کی دونوں حیثیتیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئیں، انہوں نے دستوری اسمبلی کی تجویز کی حمایت کی، ساتھ ساتھ ایک اہم ترمیم بھی منظور کرا کر رہے۔ جبری تعلیم کی تائید کی، لیکن مذہبی تعلیم کی عدم شمولیت پر سخت سے سخت نکتہ چینی کرنے میں بھی انہیں کوئی باک نہ ہوا۔

وہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ نظام کے حامی تھے۔ ہندوستان کا مستقبل ان کی آنکھوں کے سامنے روشن تھا، وہ اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارنے کے عادی نہیں تھے، دل کے ساتھ ان کا دماغ بھی روشن تھا، البانیہ، پولینڈ، یوگوسلاویہ کی مثالیں ان کے سامنے تھیں، وہ ڈرتے تھے

کہ آگے چل کر یہ ملک بھی کہیں مسلمانوں کے لئے ایک بڑا اچھوتا نہ بن جائے، اس لئے وہ ہندوستان کی سب سے بڑی قومی سیاسی جماعت کا ساتھ دیکر اس سے اپنی "انفرادیت" منوانا چاہتے تھے، یہی ان کا مقصد تھا، اور اسی کے لئے وہ پچیس ۲۵ سال سے کچھ اوپر شب و روز سرگرم کار رہے، امارت شرعیہ جمعیۃ علما اور دوسری تحریکیں سب اسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھیں۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ "وہ کسی مسئلہ پر انفرادی حیثیت سے غور نہیں کرتے تھے۔ ان کے سامنے ایک مرکب مجموعہ (COMPOSITE WHOLE) ہوتا تھا"۔ ان کی مختلف سرگرمیوں کا جائزہ لیتے وقت یہ اصول پیش نظر رہنا چاہیئے۔

کہاں تک لکھوں؟ سچی بات یہ ہے کہ ابھی دل و دماغ میں سکت ہی نہیں، اللہ سے دعا کیجئے کہ فرصت و صحت نصیب ہو تو دل کے پھپھولے توڑ سکوں، اور نہ جاننے والوں کو بتلاؤں کہ مولانا کی بے وقت موت سے مسلمانوں کا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ

(از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، سرائے میر اعظم گڈھ)

مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی ذات اس حقیقت کا نہایت واضح ثبوت تھی کہ کسی شخصیت کے اندر اصلی چیز اس کی معنوی اور ذہنی و اخلاقی طاقت ہے، مولاناؒ سے ملنے جلنے کے مواقع مجھے ان کی شاندار زندگی کے صرف آخری چند سالوں میں ملے۔ میں ہمیشہ سنا کرتا تھا کہ مولاناؒ جمعیۃ علما کے دماغ ہیں، قانونی و سیاسی مشکلات کے سمجھنے اور حل کرنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتے ہیں، اسکیمیں بنانے، ان کے چلانے، ان کے لئے مختلف الخیال و مختلف المشرب جماعتوں کو منظم کرنے کا ان میں خداداد سلیقہ ہے، پورے صوبہ بہار کے اندر ایک عظیم الاثر مذہبی تنظیم کے بانی اور قائد و امام ہیں، اور حیران ہوتا تھا کہ ایک شخص جو تاثیر و نفوذ کے تمام ظاہری اسلحہ سے بظاہر محروم ہے، آخر یہ خوارق اس کے ہاتھ سے کیسے ظہور میں آتے ہیں؟ اور رہ رہ کے دل میں خواہش ہوتی تھی کہ کاش قریب سے ان کو دیکھنے اور ان کی عجیب و غریب شخصیت کے مطالعہ کا موقع ملے۔

یہ خواہش ایک عرصہ تک دل میں پرورش پاتی رہی مگر اس کے پورے ہونے کا کوئی موقع پیدا نہیں ہوا بالآخر چند سال ہوتے ہیں (سنہ ٹھیک یاد نہیں) مظفر پور کے ایک عربی مدرسہ کے جلسہ تقسیم اسناد و دستار بندی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ خوش قسمتی سے مولاناؒ صدر تھے، اور میں منفرد دستار بندی کی تقریب سے علماء کی دستار ہی کو میں نے عنوانِ تقریر قرار دیا اور اس کی گذشتہ عظمت کو یاد دلاتے ہوئے

ان خطرات کی طرف تفصیل سے توجہ دلائی جن سے مستقبل میں اس دستار کو دوچار ہونا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس تقریر میں میں نے قدیم طرز کے عربی مدارس، قدیم طرز تعلیم، قدیم نصاب اور علمار کی روش پر نہایت تند لب و لہجہ میں تنقید کی اور ان تمام تبدیلیوں کے لئے بے جھجھک دعوت دی جو عربی تعلیم اور خود علمار کے بقا کے لئے ناگزیر ہیں۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ مولاناؒ ان خیالات کو فیاضی اور ہمدردی کے ساتھ سنیں گے۔ لیکن جلسہ ختم ہونے پر میری قیام گاہ پر مجھے ملاقات کی عزت بخشی اور میں نے نہایت تعجب کے ساتھ یہ معلوم کیا کہ مولاناؒ، نہ صرف میرے خیالات سے خوش ہیں بلکہ بڑی حد تک متفق۔

جن لوگوں کو مولاناؒ سے ملاقات کی عزت حاصل ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی گفتگو کا انداز کچھ دلکش اور جاذب نہیں تھا۔ شکل و صورت اور وضع و ہئیت بھی نہایت مسکین تھی۔ اس وجہ سے گفتگو کے پہلے مرحلہ میں میں اُن سے کچھ متاثر نہیں ہوا، لیکن جب ان کے چہرے کو غور سے دیکھا تو مجھے اُن کی آنکھوں میں ایسی گہری معنویت، اُن کی پیشانی پر ایسی پرمعنی متانت، اور ہونٹوں پر ایسی مُربیانہ مسکراہٹ نظر آئی کہ میرا دل بے اختیار ان کی طرف کھینچنے لگا۔ وہ میری تقریر پر اظہار خیال کرتے کرتے عربی مدارس کی اصلاح سے متعلق خود اپنے خیالات ظاہر فرمانے لگے، اور تھوڑی دیر کے بعد جب انہوں نے گفتگو ختم فرمائی تو مجھے دفعتہً ایسا محسوس ہوا کہ خود میرے منتشر خیالات اب ایک مرتب و مہذب اسکیم کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔

یہ ملاقات بہت مختصر رہی لیکن اس نے مولاناؒ کی خوبیوں کا ایک پائدار نقش میرے دل پر قائم

کر دیا۔ مجھ پر سب سے پہلے ان کی شخصیت کا یہ راز بے نقاب ہوا کہ ہر چند ان کی زبان تعبیر و بیانی سے قاصر ہے، مگر ان کا دماغ نہایت صاف ہے۔ وہ جس چیز پر سوچتے ہیں اس کی ابتدا، اس کا وسط اس کی انتہا سب ٹٹول لیتے ہیں اور اس کے چاروں گوشوں سے اس پر گھیرے ڈالتے ہیں، وہ مسئلہ کو گنجلک نہیں چھوڑتے اور اندھیرے میں تیر تکے چلانے کے عادی نہیں ہیں۔ اس حقیقت کے انکشاف نے میرے دل میں ان کی عظمت پیدا کر دی اور میں نے محسوس کیا کہ ذہنی اعتبار سے، یہ بڑے آدمی ہیں۔

دوسری خوبی جو اس صحبت میں سامنے آئی، وہ ان کی رواداری اور فیاضی تھی۔ میں ان کو ایک مخصوص جماعت کا آدمی سمجھتا تھا اور کبھی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ جماعت کے جراثیم ان کے دل کے ساتھ چپکے ہوئے نہیں ہونگے۔ لیکن اس ملاقات میں میں نے محسوس کیا کہ ان کے دماغ کی طرح ان کا دل بھی بہت کشادہ ہے، وہ کسی خاص دائرہ کے اندر بند نہیں ہیں، وہ سب کے ساتھ اور سب سے الگ ہیں۔ وہ کیتھولک چرچ کی طرح دینداری اپنی ہی چہار دیواری کے اندر محدود نہیں سمجھتے۔ اس سے باہر بھی دنیا کا وجود مانتے ہیں اور اس کے ساتھ معاملہ کرنے کے لئے پوری طرح فیاض ہیں۔ ان کی اس خوبی نے میرے دل کو جیت لیا۔ اور میں نے یقین کر لیا کہ اسی چیز کے اندر ان کی تنظیمی قابلیت کا راز مضمر ہے۔

پہلی ملاقات میں ان کی یہ دو خوبیاں میرے سامنے آئیں اور میں نے عجلت میں یہ رائے قائم کر لی کہ مولانا کے سلاح خانے میں بس یہی دو ہتھیار ہیں جن سے ان کی تمام فتوحات ظہور میں آئی ہیں۔

اس ملاقات نے میرے دل میں مولاناؒ سے مخلصانہ عقیدت پیدا کردی، اور مولاناؒ کے دل میں میرے لیے مربیانہ شفقت۔ اس کے بعد سے وہ کبھی کبھی سیاسی و مذہبی جلسوں میں مجھے یاد فرماتے لگے اور گو میں نے اس طرح کے مجامع کے لئے اپنے تئیں کبھی اہل خیال نہیں کیا، مگر ان کے حکم کی تعمیل میں کبھی کبھی شریک ہونا پڑا۔ ان جلسوں کی شرکت کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ ان کی نسبت میری پچھلی رائے عاجلانہ تھی، وہ اس سے بہت زیادہ ہیں جتنا میں نے اُن کو سمجھا ہے، اسکیموں کا بنانا، گتھیوں کا سلجھانا، عقدوں کا حل کرنا، پیچوں کو سمجھنا، بند راہوں کو کھولنا، یہ باتیں کتنی ہی وقیع اور اہم سہی، اور ان سے مولاناؒ کے ذہن کی صفائی اور عقل کی تیزی اور رسائی کی کتنی ہی شہادتیں فراہم ہوتی ہوں مگر یہ سب مولاناؒ کی شخصیت کے ظاہری شئون ہیں۔ ان کی اصلی بڑائی ان کے اس کردار کے اندر چھپی ہوئی ہے جس میں وہ پوری طرح پختہ ہو چکے ہیں، جس طرح ان کی ہر خاموشی، بامعنی اور ہر گویائی گرہ کشا ہوتی ہے، اسی طرح ان کی ہر ادا ان کی سیرت کی پختگی اور ان کے کردار کی مضبوطی کا پتہ دیتی ہے۔

جمعیۃ علماء کے جو جلسے گذشتہ چند سالوں کے اندر ہوئے ہیں، ان میں سے بعض میں، مولاناؒ ہی کی دعوت پر میں شریک ہوا۔ ان جلسوں کی مخالفت میں جو ہنگامے اٹھے ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، بعض مرتبہ تو مخالفین کی خوش تمیزیاں ایسی ہولناک شکل اختیار کرلیتی تھیں کہ آدمی کے ہاتھ سے دامن صبر چھوٹ جائے یا دامنِ اُمید۔ اور ظاہر ہے کہ ان تمام یورشوں کا اصلی نشانہ، کم از کم صوبۂ بہار میں، مولاناؒ ہی کی ذات تھی، مگر میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ مولاناؒ ان ہنگاموں سے

ایک لمحہ کے لئے بھی بے حوصلہ یا بے صبر ہوئے ہوں۔ ان کا دماغ ہمیشہ پُرسکون اور دل ہر حالت میں مطمئن رہتا تھا۔ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر وہ پسند کرتے تو اپنے مخالفوں کے اوچھے ہتھیاروں کا مقابلہ اوچھے ہتھیاروں سے کر کے ان کو زک دے سکتے تھے مگر اپنے طرزِ عمل کی کامیابی کا یقین کسی حالت میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا اور ان کی اولوالعزمی ہمیشہ اوچھے ہتھیاروں کے استعمال سے دبا کرتی تھی۔ مولانا کی یہ عزیمت اگر بے مثال نہیں تو کم از کم اپنی نوعیت میں غیر معمولی ضروری تھی۔ اس عزیمت کے ساتھ وہ انتھک کام کرنے والے تھے۔ میں نے ان کو کبھی خالی الذہن یا غیر مشغول نہیں پایا، وہ سوچتے یا کام کرتے، سستاتے کبھی نہیں تھے، وہ ایک ایسی دریا کے مانند تھے جس میں تموج وطغیانی کی سرجوشی تو نہ ہو لیکن روانی کا پورا جوش وخروش موجود ہو، جو بغیر دم لئے ہر آن وہر لمحہ چٹانوں سے ٹکراتا، پتھروں سے لڑتا، جھاڑیوں سے الجھتا، رواں دواں، ان کے پبلک اشغال نہ نمائش کے طور پر تھے نہ حصول سروری وسعادت کی طمع میں۔ وہ جس مسئلہ کو اٹھاتے وہ زندگی اور موت کا سوال بن کر ان سے چمٹ جاتا اس لئے وہ کسی کام کو بے دلی (DISHEARTEDLY) کے ساتھ کر کے اپنے نفس کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے، بلکہ مجبور تھے کہ اس کے لئے اپنے فکر وعمل کی تمام قوتیں میدان میں ڈال دیں۔ سوتے جاگتے بس وہی مسئلہ ان کے سامنے ہوتا اور ان کی ساری راحت وطمانیت اس کے انہماک کے اندر سمٹ آتی۔ وہ اپنے پبلک اشغال سے تھک کر نہ تو کوئی امن کا گوشہ تلاش کرتے، نہ دوسری غیر پبلک دلچسپیوں کو ان کے ساتھ شریک کر کے ان کی حرارت کو بٹہ لگاتے۔ اس اعتبار سے ان کا مزاج ایک سیاسی لیڈر سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی دھن

میں عاشق کی دھن کی شان تھی۔ اور چونکہ وہ ایک زبردست عالم تھے اس لئے یقیناً یہ چیز انہوں نے پیغمبران عظام کے اسوۂ حسنہ سے اخذ کی تھی۔ میں نے یہ چیز وقت کے بڑے سے بڑے لیڈروں میں بھی نہیں پائی۔

مولاناؒ کے اخلاق میں ایک عجیب چیز ان کی محبت بھی تھی، جو تصنع اور بناوٹ کے ہر شائبہ سے بالکل پاک تھی، اس محبت کا اظہار نہ تو وہ لفظوں سے کرتے، نہ سیاسی لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کی مصنوعی اداؤں سے، وہ سراپا عمل تھے، اس لیے ان کی محبت بھی عملی تھی۔ میں جب کبھی ان سے ملا مجھے محسوس ہوا کہ ان کی محبت کے فیضان میں نہا گیا ہوں، حالانکہ وہ زبان سے اور تو کچھ کہتے نہیں تھے، اور اگر کچھ کہتے تھے تو میں نہ تو اس کے سننے کی کوشش کرتا نہ سمجھنے کی۔ وہ اپنے ساتھیوں پر پورا اعتماد کرتے تھے، اور قابل طبیعتوں کے جوہر نمایاں کرنے کے لئے استاد کی طرح شفیق، اور باپ کی طرح فیاض تھے۔

مولاناؒ نے اسلامی قانون کا نہایت اچھا مطالعہ کیا تھا۔ تمام حاضر الوقت مسائل میں وہ حیرت انگیز سرعت کے ساتھ شرعی نقطۂ نظر متعین کر لیتے تھے، ان کی نظر نہایت گہری تھی، بسا اوقات پہلے میں ان کی رائے کمزور معلوم ہوتی مگر ان کی تنقیحات کے بعد جب مسئلہ پوری روشنی میں آجاتا تو ہر شخص ان کی اصابت رائے کی داد دیتا۔ پھر وہ صرف جزئیات کے مفتی نہیں تھے، بلکہ اسلامی نظام کو اس کے تمام اشکال و صورتیں جانتے اور سمجھتے تھے۔ اور اس کے اصولی و فروعی مسائل کی پوری معرفت رکھتے تھے۔ ان معاملات میں بصیرت رکھنے والے ہندوستان میں بہت کم ہیں، مولاناؒ ان

میں سے ایک تھے۔

مولاناؒ جس انقلاب کے داعی تھے' اس کا پروگرام بالکل شرعی اور مذہبی تھا۔ ان کو پورا اعتماد تھا کہ اگر مسلمانوں کی تنظیم جمعیۃ علمار کی قیادت میں ہو جائے تو مسلمان ہندوستان کے اندر ایک ایسا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو ہندوستانی قومیت میں شامل ہونیکے باوجود ان کی حفاظت کر سکے گا۔ وہ اس کو مسلمانوں کے لئے ایڈیل نہیں سمجھتے تھے' مگر اس سے زیادہ کے لئے حالات سازگار نہیں پاتے تھے۔ وہ سیاسی نظریات میں عملی و مادی پہلو (MATERIAL FORM) پر نظر رکھنے کے زیادہ عادی تھے اور تری تصوریت (ABSTRACT IDEOLOGY) کے قسم کی کوئی چیز ان کو بہت کم اپیل کرتی تھی۔

میں یہ سطریں لکھتے وقت جب خیال کرتا ہوں کہ اب وہ دنیا میں نہیں رہے تو غم سے دل پارہ پارہ ہونے لگتا ہے' ان کی اصابت رائے اور قوت عمل پر مشکل سے مشکل وقتوں میں بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔
اللہ تعالیٰ مولاناؒ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ہماری قوم کے اندر ان کا صحیح جانشین پیدا کرے۔

دو آنسو

حضرت مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں

(از جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان بریلی)

آپ نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب مرحوم کے متعلق اپنے تاثرات آپ کے "مجموعہ مضامین" کے لئے لکھوں ـــــــ میرا ارادہ تھا کہ "ولی اللہ نمبر" کی اشاعت کے بعد "الفرقان" کے پہلے شمارہ میں حضرت مرحوم کے متعلق اپنے تاثرات، بلکہ اپنے معلومات کچھ تفصیل سے لکھوں گا۔ ممکن ہے کہ اس ارادہ کی تکمیل کا موقع بھی ملے، اس وقت تو آپ کی فرمائش کی تعمیل میں یہ چند سطریں حوالۂ قلم کر رہا ہوں۔

جب سے حضرت مرحوم کی وفات کی خبر ملی ہے، ایک دن، بلکہ شاید کسی دن کا ایک پہر بھی ایسا نہ گذرا ہوگا کہ حضرت مرحوم کی یاد نہ آئی ہو، ان کو یاد کرتا ہوں اور مرحوم اقبال کا یہ شعر پڑھتا رہتا ہوں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجھے حضرت مرحوم سے ایسی ملاقات کا شرف (جس کو ملاقات کہا جاتا ہے) پہلی بار غالباً ۲۸ء میں حاصل ہوا، یہ وہ زمانہ تھا کہ جمعیۃ علماء نے اپنی راہ نہرو رپورٹ کے مسئلہ پر کانگریس سے الگ کر لی تھی۔

مراد آباد میں جمعیۃ مرکزیہ کی مجلس منتظمہ کا اجلاس تھا اس سے فارغ ہو کر میں اپنے اُس وقت کے اقامتی وطن امروہہ کے لیے مراد آباد سے دہلی کی ٹرین میں سوار ہوا۔ اسی گاڑی سے حضرت مفتی صاحب مدظلہٗ اور حضرت مولانا محمد سجاد مرحوم دہلی کے لیے روانہ ہوئے مراد آباد سے امروہہ تک راستہ تقریباً صرف ایک گھنٹہ کا ہے۔ اتنے ہی وقت میں وقتی مسائل کے متعلق جو گفتگو رہی جس میں زیادہ حصّہ مولانا محمد سجاد صاحب مرحوم ہی کے افادات کا تھا۔ اس سے میں نے پہلی بار یہ اندازہ کیا کہ یہ شخص اپنی شان کا نرالا "عالم" ہے۔

اسی دن سے میرے قلب پر اُن کی عظمت کا سکہ بیٹھ گیا اور میں اُن کو دورِ حاضر میں کم از کم طبقہ علماء میں اسلامی سیاست کا اعلیٰ ماہر سمجھنے لگا۔ میں صاف کہتا ہوں کہ پھر اس کے بعد سے آج تک اس باب میں حلقۂ علماء میں سے کسی کی بھی عظمت و جلالت کا میں ذہن میں داخل نہ ہو سکا۔ پھر اس پہلی صحبت کے بعد کی ہر صحبت اور ہر ملاقات ان کی عظمت کے اس احساس میں اضافہ ہی کرتی رہی۔

مجھے حضرت مرحوم کی جس خصوصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے کہ "پارٹی فلنگ" اور "جماعتی مسلک" سے بالاتر ہو کر وہ ہر مسئلہ پر غور کرتے تھے۔ پہلے کوئی رائے قائم کر کے یا کسی جماعت کے فیصلہ کو سامنے رکھ کر خواہ مخواہ اس کی تائید میں مواد فراہم کرنے کے وہ عادی نہ تھے بلکہ پہلے ملی ضروریات اور واقعات و حالات پر غور کرتے اور تہ میں ڈوب کر غور کرتے تھے اور پھر جس نتیجہ پر پہنچتے اسی کو "مسلک" بنانے اور اپنے رفقاء سے منوانے کی کوشش کرتے تھے ——— ہندوستان کے سیاسی مسائل میں بھی بس "اسلام" اور "مسلمانوں" کی مذہبی ضروریات ہی آپ کی غور و فکر کا مرکز اور محور تھے۔

آپ کے قلم سے نکلی ہوئی چند متفرق چیزیں اب بھی لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہیں مثلاً جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ مرادآباد ۱۹۲۵ء کا خطبۂ صدارت مسلم انڈی پنڈنٹ کانفرنس کا خطبۂ صدارت کچھ "نقیب" میں شائع شدہ متفرق مقالات، نظارت امور شرعیہ کی مختصر اسکیم اور مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وہ مفصل تجویز جو مسلم آزاد کانفرنس کے اجلاس دہلی منعقدہ مارچ ۱۹۴۰ء کے لیے مولانا مرحوم ہی نے مرتب کی تھی، ان ہی چیزوں سے سیاسی دُوربینی اور ہندوستانی مسلمانوں کے اصل مسئلہ کی گرفت اور اس کے ممکن العمل اور متوقع الحصول صحیح حل کے دریافت میں دوسرے حضرات پر آپ کی سبقت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس "تحزّب الاحزاب" کے زمانے میں ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی جو "رشتے" مثلاً ہم استادی، ہم شیخی، یا کسی ایک خاص سلسلہ" میں انسلاک وغیرہ وغیرہ جو عموماً اتحاد و ارتباط میں مؤثر سمجھے جاتے ہیں، مجھے حضرت ممدوح سے کوئی ایک بھی ان میں سے حاصل نہ تھا لیکن ان کے اخلاص، ورع و تقویٰ، دین کی بے لوث فدائیت اور سب سے زیادہ سیاسیات میں، ان کے پختہ اسلامی انداز فکر نے مجھے ان سے اس قدر وابستہ کردیا تھا کہ اپنے جن محترم بزرگوں سے مجھے اس قسم کی نسبتیں بھی حاصل ہیں، ان کے ساتھ بھی مجھے اس سے زیادہ وابستگی نہیں۔

کوئی چھپی حقیقت نہیں اور کم از کم "جمعیۃ علماء" سے تعلق رکھنے والوں میں تو سب ہی کو معلوم ہوگا کہ کانگریس کی منسٹری قبول کرلینے کے بعد سے راقم الحروف کی ذاتی رائے شرکت کانگریس کے مسئلہ میں جماعت کے عام رجحان کے خلاف رہی، اُسی زمانے میں حضرت مرحوم نے جو اس وقت

اس مسئلہ میں بہ نسبت دوسرے اکابر کے مجھ سے قریب الخیال تھے۔ "منظم شرکت" کی ایک خاص شکل تجویز فرمائی اور "نظام ملت" کے عنوان سے ایک مفصل اسکیم اس کے لئے مرتب فرمائی تھی ا.. "شرکت" کا یہ صحیح راستہ تھا، اور اس نظام کے ماتحت جو شرکت ہوتی وہ یقیناً بہت وزن دار ہوتی، مولانا مرحوم نے وہ اسکیم مطالعہ کے لئے مجھے بھی عطا فرمائی، میں نے دیکھ کر عرض کیا کہ اگر آپ اس کو جماعت سے منوالیں تو میں اس اصول پر شرکت کا سب سے بڑا حامی ہوں۔ اور اس نظام کو بروئے کار لانے کے لئے چھ مہینے کے لئے اپنی خدمات بھی پیش کر سکتا ہوں ـــــ لیکن بد قسمتی کہ اس وقت غالباً ہمارے "تیز رو طبقہ" کے اس سے متفق نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسکیم بس یونہی رہ گئی اور بعد میں حالات بھی اس کے لئے ساز گار نہیں رہے۔

۳۷ء سے آخر ۳۹ء تک اسلامی ہند کی سیاست میں جو بحرانی دور گزرا جس میں ہر خیال کے کارکنوں کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا، اس وقت جو چند چیدہ حضرات اس رَو میں بہنے سے محفوظ رہے ان میں ایک ممتاز ہستی حضرت مولانا مرحوم کی تھی، میں اس دور میں اُن کے خیالات سے اگرچہ کلیتہً یعنی سو فی صدی تو متفق نہ تھا بلکہ صرف قریب تر تھا لیکن اگر کسی کی رائے کو اپنے شرح صدر کے بغیر ماننا ہوتا ہے تو حضرت مرحوم کی رائے کو یقیناً میں اس کا مستحق سمجھتا تھا۔ میں عرض کر چکا کہ ہر معاملے میں دینی مصلحت کو وہ ہر چیز پر مقدم رکھتے تھے، اس لئے اس بارے میں اُن سے چوک اور غفلت عموماً نہیں ہوتی تھی۔ کانگریس سے اشتراک کے باوجود مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ میں بہار کی کانگریسی حکومت کے غلط اور مسلمانوں کے لئے دینی حیثیت سے سخت مضرت رساں

رویہ کی مصلحانہ مخالفت انہوں نے جس ایمانی شان کے ساتھ کی، اور پھر جس طرح وزارت کو اپنے رویہ کی تبدیلی پر مجبور کیا وہ صرف انہی کی بے لاگ عزیمت اور دانشمندی کا کرشمہ تھا۔

اخبار بین طبقہ کو یاد ہوگا، کہ ۱۹۴۷ء کے شروع مہینوں میں "واحد قومیت" کے مسئلے پر گاندھی جی نے اپنے اخبار ہریجن میں مسلسل مضامین لکھنے شروع کئے اور ان میں "ایک قوم" کے نظریے کو ایسے انداز میں انہوں نے پیش کیا جس کو اسلام کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا بلکہ اگر مسلمان اس کو قبول کر لیں تو یقیناً ان کو دین کے بڑے حصے سے دست بردار ہونا پڑیگا — کانگریس سے تعلق رکھنے والے ذمہ دار حضرات میں حضرت مولانا مرحوم ہی نے سب سے پہلے پوری تفصیل کے ساتھ گاندھی جی کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا اور بتلایا کہ "واحد قومیت" کا جو تصور آپ رکھتے ہیں، وہ مسلمانوں کیلئے ناقابل قبول ہونے کے علاوہ واقعات کے لحاظ سے بھی محض غلط ہے اور ایسی "متحدہ قومیت" کا کوئی تصور اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جبتک کہ ہندوستان میں ایک مسلمان بھی باقی ہے۔ بلکہ گاندھی جی یا ان کے چیلوں کا اس غلط مفروضہ پر اصرار ہندوستان کے سیاسی مسایہ کو بجائے آسان کرنے کے اور زیادہ مشکل کر دیگا۔

اسی طرح جب ایک مرتبہ گاندھی جی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسلام میں "اہنسا" کا تصور ہے تو اپنے حلقہ میں مولانا ہی نے پوری جرأت و عزیمت کے ساتھ سب سے پہلے خلاف قلم اٹھایا اور بتلایا کہ سیاسی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھنے کے باوجود گاندھی جی کے معلومات اسلام کے بارہ میں ایک عام مکتب سے زیادہ نہیں ہیں۔

غرض مولاناؒ اپنے سیاسی انہماک کے باوجود اپنی ایمانی ذمہ داریوں سے کسی وقت بھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ اور جب کوئی چیز اسلام یا مسلمانوں کے مذہبی مفاد کے خلاف سامنے آتی تھی تو اپنی جماعت میں سب سے پہلے اکثر اُنہی کا قلم حرکت میں آتا تھا — اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کی خاص بصیرت بھی عطا فرمائی تھی' اس لئے معاملہ کے مخفی سے مخفی گوشوں کو بھی وہ دیکھ لیتے تھے۔

ایک واقعہ اور یاد آیا' لکھنؤ میں مدح صحابہؓ ایجی ٹیشن جاری تھا' حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ' اور مولانا مرحوم اس کی قیادت فرما رہے تھے۔ جمعہ کا دن تھا جس دن کہ قانون امتناع مدح صحابہ کی خلاف ورزی کر کے اجتماعی سول نافرمانی کی جاتی تھی' ٹیلے کی مسجد اس جنگ کا محاذ تھا' نماز جمعہ کے بعد وہیں پر پہلے جلسہ ہوتا تھا' اس کے بعد سول نافرمانی کی جاتی تھی' مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی بڑا مجمع ہو جاتا تھا اور ان کے لئے قناتوں کے ذریعے پردہ کا انتظام کیا جاتا تھا جب گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پردہ نشین عورتوں کے مجمع میں سے ایک خط ایک بچہ کے ذریعہ صدر جلسہ کے نام پہنچا' اس میں ایک عورت نے اپنے دینی ولولہ کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا کہ "اس ایجی ٹیشن میں عملی حصہ لینے کا موقع مجھ کو اور میری اور بہنوں کو بھی دیا جائے"۔ اس کے لئے اس خط میں صحابیات کی شرکت غزوات کا حوالہ بھی دیا گیا تھا۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدظلہ' نے جو اس دن جلسہ کے صدر تھے' راقم الحروف سے فرمایا کہ لاوڈ اسپیکر کے پاس جا کر تم اس خط کا میری طرف سے زبانی جواب دیدو اور ان بہنوں کو بتلا دو کہ ابھی تو ہم لوگ باقی ہیں' جب تک ہم میں سے ایک بھی موجود ہے' یہ گوارہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اس راہ میں کوئی تکلیف اٹھائیں — میں چلنے لگا تو حضرت نے میرے ساتھ مرحوم

نے فرمایا کہ اس کے علاوہ مستورات کو یہ بھی سمجھا دیا کہ "حریب علمی" (یعنی آئینی جنگ یا سول نافرمانی) اور تلوار کی جنگ، کے احکام شریعت میں جداگانہ ہیں۔ تلوار کی لڑائی میں تو خاص حالات میں عورتوں کے لیے بھی شرکت کا موقع ہو جاتا ہے، مگر یہ آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتاری کرایا جاتا ہے اس میں شرکت کا عورتوں کے لیے کوئی موقع نہیں ہوتا، بلکہ شرعاً ان کے لیے یہ ناجائز ہے کہ وہ اپنے کو غیر آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کرا کے قید میں جائیں۔ لہٰذا ان بہنوں کا جذبۂ قربانی تو قابل قدر ہے لیکن سول نافرمانی میں عملی شرکت کے خیال کو وہ قطعی طور پر دل سے نکال دیں کہ ان کے حق میں یہ معصیت اور خدا کی نافرمانی کا باعث ہے۔

یہ بھی حضرت مرحوم کی وہ خصوصیات تھیں جنہوں نے مجھے ان کا فریفتہ کر دیا تھا، اور واللہ العظیم اگر میرے بس میں ہوتا تو میں سیاسی کام کرنے والے کم از کم نوجوان علماء کے لئے تو فرض قرار دیتا کہ وہ پہلے کچھ دنوں حضرت مرحوم کی زیر نگرانی ٹریننگ حاصل کریں۔

حضرت مرحوم سے میری آخری ملاقات گزشتہ جولائی کے اواخر میں دہلی میں ہوئی، دوران گفتگو میں نے مختلف سیاسی کانفرنسوں میں دیکھی ہوئی بعض سخت درجے کی شرعی بے عنوانیوں کا ذکر کر کے عرض کیا کہ اس قسم کی سیاسی مجالس میں بعض اوقات بڑی کھلی ہوئی اور خدا کو انتہائی ناراض کرنے والی منکرات بھی دیکھی جاتی ہیں، ان کا بقدر استطاعت انسداد اور کم از کم نکیر تو نہایت ہی ضروری ہے لیکن ہم لوگ اس میں اکثر کمزوری دکھاتے ہیں اور بے دینوں کے "تنگ خیالی" کے طعنہ سے ڈر کر خاموش رہتے ہیں، حالانکہ اس سے ایک بڑا ضرر یہ پہنچ رہا ہے کہ عوام ہم لوگوں کو بھی

ان منکرات میں شریک سمجھتے ہیں، پھر یا تو دین کے معاملہ میں وہ ہم کو متہم اور ناقابل اعتماد سمجھنے لگتے ہیں، اور یا اُن کے دلوں سے ان منکرات کی بُرائی کا احساس زائل ہو جاتا ہے۔

فرمایا "میں تو اس بارہ میں ادنیٰ "رواداری" کو مداہنت سمجھتا ہوں"۔ پھر ایک سیاسی کانفرنس کا حوالہ دیکر (جو چند ہی روز پہلے دہلی میں ہو چکی تھی) فرمایا کہ اس میں ایک واقعہ اس قسم کا پیش آیا ہم نے خاموشی جائز نہ سمجھی اور فوراً کہدیا کہ چیز غلط اور معصیت ہے۔ پھر یک لخت آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور فرمایا کہ "فسق والحاد کے عموم وشیوع کی وجہ سے ہماری دینی حس بڑی حد تک ماؤف بھی ہو چکی ہے اور مجھے تو بسا اوقات شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم لوگوں میں ایمان کا ادنیٰ درجہ بھی ہے یا نہیں، حدیث فرمایا گیا کہ ہاتھ یا زبان سے برائی اور گناہ کو روکنے کی طاقت نہ ہونے کی صورت میں اس سے قلب میں نفرت، اور عندالاستطاعت اس کے خلاف عملی یا قولی جہاد کی نیت ہر مسلمان کا فرض ہے اور یہ ایمان کا ادنیٰ درجہ ہے جس کے بعد کوئی اور درجہ ہے ہی نہیں (ولیس وراء ذلک مثقالُ حبۃِ خردلۃٍ من ایمان اوکما قال علیہ الصّلوٰۃ والسّلام) اور ہم ملاحدہ اور فساق بلکہ کھلے کفار ومشرکین کو علانیہ فسق والحاد اور کفر وشرک کرتے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ہمارے قلب میں بھی اس کے خلاف کوئی غیظ وغضب پیدا نہیں ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے اس ادنیٰ اور آخری درجے سے بھی اُس وقت شاید ہم خالی ہوتے ہیں"۔

درحقیقت اپنے ایمان پر یہ خوف وخشیت ہی "روح ایمان" ہے اور یہی وہ "تقویٰ" ہے جس کو ابن ابی ملیکہ نے صحابہ کرامؓ سے بایں الفاظ نقل کیا ہے (فی البخاری تعلیقاً) قال ابن ابی ملیکۃ لقیتُ

ثلثین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کلھم یخشی علی نفسہ النفاق۔

یہ تو تھے حضرت مرحوم کے متعلق میرے تاثرات' اور منتشر معلومات' اب مجھے دو کلمے حضرت مرحوم کے ان احباب و رفقاء اور اُن عقیدت کیشوں و نیاز مندوں سے بھی عرض کرنے ہیں جو اُن کی وفات سے غم زدہ اور اس حادثہ سے سوگوار ہیں۔

میرے بزرگو! اور بھائیو!! دنیا میں یہ دن تو سبھی کے لیے آتا ہے جو یہاں آتا ہے اس کے لئے یہاں سے چلا جانا بھی مقرر ہے' تاہم حضرت مولاناؒ کی جدائی کا رنج ضرور ہے' اور وہ برحق ہے اور خود میں تو اس کو اس درجہ میں محسوس کرتا ہوں کہ ؎

انچہ از من گم شدہ گر از سُلیماں گم شدے

ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

لیکن کفران نعمت ہو گا اگر اس کا احساس نہ کیا جائے کہ جانے والے نے آپ کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے' اُن کے پہچاننے والوں اور اُن سے تعلق رکھنے والوں کو معلوم ہو گا کہ "ملت اسلامیہ ہند" کے دو مسئلے اس آخری زمانے میں بلکہ ان کی سیاسی زندگی کے آغاز ہی سے ان کی توجہ کا خاص مرکز تھے اور خدا کی قسم اگر قدرت کی طرف سے آج بھی ان کو بولنے اور اپنی آواز ہم تک پہنچانے کا موقع مل جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ قبر میں سے پکار کے انہی دو چیزوں کے متعلق عہد حاضر کے مسلمانوں کو وصیت فرمائیں گے ۔۔۔۔ ایک ۔۔۔ قیام نظام امارت اور نصب امیر فی الهند

دوسرے ------ کم از کم مسلمانوں کی حد تک "نظام شرعی" کو اپنی پوری وسعت کے ساتھ ہندوستان میں مستقل آئینی حیثیت حاصل ہو جانا۔

ان دونوں کاموں کے متعلق حضرت مرحوم نے روشنی حاصل کرنے والوں کے لئے کافی سامان چھوڑا ہے، اب حضرت مرحوم کے ساتھ عقیدت و نیازمندی کا جن کو تعلق ہے یا کم از کم ان دونوں مسئلوں میں وہ حضرت مرحوم کے نقطۂ نظر سے متفق ہیں ان کا فرض ہے کہ ان دونوں کی تکمیل کی طرف وہ بیش از بیش توجہ کریں اور مرحوم کے نامکمل کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں، یہی چیز حضرت مرحوم کی روح پاک کو، یہاں کی فکروں سے مطمئن اور متوسلین کی طرف سے خوش کر سکتی ہے۔

آخر میں تعزیت مسنونہ اور دعائے رحمت پر اختتام کرتا ہوں۔ اِنَّ فی اللّٰہ عزاءً من کُلِّ مصیبۃٍ ودرکاً من کل فائت فباللّٰہ فثقوا وایاہ فارجوا انما المصاب من حرم الثواب اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ واجعل الجنۃ الخلد مثواہٗ برحمتک یا ارحم الراحمین۔

مولانا رح کی یادیں

(از مسعود عالم ندوی)

راقم نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں، وہاں چار بزرگوں کے نام بڑے احترام سے لیے جاتے تھے، اُن میں دو زندہ تھے۔ اور دو ابدی نیند سو چکے تھے، میری والدہ مرحومہ اپنے والد ماجد مولانا عبدالصمد ادگانوی (متوفی ۱۳۱۸ھ) اور اپنے خالو مولانا وحید الحق استھانوی (م ۱۳۱۵ھ) کے نام بڑے احترام سے لیا کرتیں، ان کے کارنامے سنایا کرتیں، ان کے دینی جوش اور قومی خدمات کا ذکر بڑے خلوص سادگی اور سچے ولولے کے ساتھ کیا کرتیں۔ زندوں میں وہ اپنی ننہال (پنہسہ ضلع پٹنہ) کے دو بزرگوں کا تذکرہ بہت اخلاص سے کرتیں۔ بڑے بھائی، جو صوفی و تہجد ویہ تھے (اور ابتک ہیں) بڑے مولوی صاحب، اور چھوٹے بھائی، جو اُس وقت بھی (یعنی آج سے بیس پچیس برس پہلے) بڑے عالم کی حیثیت سے مشہور تھے، چھوٹے مولوی صاحب کے نام سے یاد کیے جاتے۔

اچھی طرح یاد نہیں کہ چھوٹے مولوی صاحب کی خدمت میں، مجھے پہلی بار کب نیاز حاصل ہوا، تحریک خلافت کے ہنگامہ خیز دنوں میں، راقم ایک انگریزی اسکول کا طالب علم تھا، والد ماجد مقامی خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کے خاص کارکن تھے اسکول چھوڑ کر مدرسہ آنا پڑا، والد ماجد کے یہاں آئے دن جمعیۃ العلماء اور خلافت کمیٹی کی گشتی چٹھیاں آتی رہتی تھیں، خیال آتا ہے کہ سب سے پہلے انہیں مراسلوں میں "ابوالمحاسن محمد سجاد کان اللہ لہ" نظر سے گذرا، انہی دنوں ایک

روداد انجمن علمائے صوبہ بہار (سنہ ۱۹۱۶ء) کہیں پڑی ہوئی ملی، بے سمجھے بوجھے پڑھ گیا۔ اُس روداد سے اور کوئی فائدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ پر اس وقت حافظہ پر زور دینے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مولانا محمد سجاد مرحوم کا نام ذہن و دماغ پر پہلے پہل اسی روداد کے ذریعہ مرتسم ہوا۔

غالباً سنہ ۲۲ء کا ذکر ہے، بعض عزیزوں کے بلاوے پر پہلی مرتبہ پنہسہ جانا ہوا۔ وہاں خاندانی نشست گاہ میں ایک چوتھائی حصہ گھرا ہوا ملا۔ معلوم ہوا کہ یہ مولوی صاحب کی بیٹھک ہے۔ اور لوگوں کے فسق و فجور سے آنکھیں بچانے کے لیے انھوں نے پردہ کی دیوار کھڑی کر دی ہے، اس کے بعد کئی سال تک مسلسل اور بار بار پنہسہ جانا ہوا، لیکن مولاناؒ ایک ہی دو مرتبہ دکھائی دیے، اور شاید ایک آدھ بار میں نے سلام کرنے کی بھی ہمت کی، ایک بزرگ نے بلا کر مولاناؒ کے پاس بٹھایا بھی، پر کوئی گفتگو یاد نہیں۔

مدرسہ کی تعلیم کے دو چار زینے طے ہو چکے تھے کہ مدرسے (مدرسہ عزیزیہ بہار شریف) ہی کے احاطے میں اصلاح نصاب تعلیم کے متعلق علماء کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی، شوال کی ابتدائی تاریخیں تھیں، مدرسہ ۸ر شوال کو کھلتا تھا۔ لیکن جلسہ کے شوق میں، میں وقت سے پہلے بہار آ گیا، اور تمام نشستوں میں حاضر رہا۔ اُس وقت مجھے پہلی مرتبہ مولاناؒ کی عظمت کا احساس ہوا، بڑے بڑے علماء کا مجمع تھا، مولانا عبدالوہاب صاحب مہتمم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ صدر نشین تھے۔ بحث و تمحیص میں حصہ لینے والوں میں مولانا ابو نعیم محمد مبارک کریم صاحب (سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز بہار) اور مولانا حکیم شرف الحق صاحب

بہار کی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن اجلاس کے رُوح رواں مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ ہی تھے' مولاناؒ چاہتے تھے کہ صوبہ بہار کے تمام عربی مدرسے ایک نظام کے ماتحت آجائیں اور ایک نصاب تعلیم پر ہر جگہ عمل در آمد ہو۔ اس تجویز کے ذریعہ اصل میں وہ مدرسہ اگزامنیشن بورڈ کے نئے فتنے (جو اُس وقت نیا تھا) کا سد باب کرنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ سرکاری امتحانات کے بدلے' آزاد قومی امتحانات ہوں۔ تجویز یہ بھی تھی کہ مدرسہ عزیزیہ کو اس نئے قومی تعلیمی نظام کا مرکز قرار دیا جائے' اور اپنی پائدار مالی حیثیت کی وجہ سے وہ اس کا اہل بھی تھا۔ اجلاس تو کامیاب رہا' اور ہم ناسمجھ تو بڑی امیدیں لیکر اٹھے تھے' لیکن کچھ ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ خود ہمارا مدرسہ سرکاری اگزامینیشن بورڈ سے ملحق کر دیا گیا۔ جب حریفوں نے مجوزہ مرکز ہی کو توڑ لیا' تو پھر کیا امید ہو سکتی تھی؟

اس اجلاس کا راقم کے دل و دماغ پر بڑا اثر رہا' اور مولاناؒ کی اس مفید تجویز کی ناکامی کا داغ آجتک دل سے محو نہ ہو سکا ـــــ اس کے بعد دن گذرتے چلے گئے' اخباروں میں مولاناؒ کے کاموں کی روداد یں پڑھتا رہا۔ جریدہ امارت کا خریدار بھی تھا۔ گھر پر بھی مولاناؒ کا ذکر خیر رہتا' لیکن ایک عرصہ تک کوئی تفصیلی گفتگو یا ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہو سکی،

جولائی ۲۲ء یا اس کے لگ بھگ راقم دہلی جا رہا تھا' کسی عربی مدرسہ میں تکمیل تعلیم کا قصد تھا' والد صاحب نے مولاناؒ کو خط لکھا' مولاناؒ دورے میں تھے' کچھ تعویق سے ان کا گرامی نامہ ملا' اور اُس میں ایک طویل مکتوب مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے نام تھا۔ جس میں راقم کی احتیاج اور دقت کے

دوسرے مسئلوں پر اظہار رائے کے علاوہ راقم کے لیے سفارش کی گئی تھی ---- یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا کو اس خادم کی ذات سے دلچسپی پیدا ہوئی، جو روز بروز بڑھتی گئی اور آخر وقت تک قائم رہی لیکن تفصیلی گفتگو اور بلا واسطہ نیازمندی اب بھی حاصل نہیں تھی۔

دلی کا ماحول راس نہ آیا، تو میں ندوہ چلا آیا، سنہ صحیح یاد نہیں غالباً میں تکمیل ادب میں تھا، سنہ ۲۹ یا ۳۰ ہو، چھٹیوں میں وطن آرہا تھا، بختیار پور میں مولانا پر نظر پڑی، مشتاقانہ ان کی طرف بڑھا، وہ بھی تیسرے ہی درجہ میں سوار ہوئے اور بہار شریف تک کامل دو گھنٹے شرف صحبت حاصل رہا، یہ پہلا موقع تھا کہ مولانا سے کسی ملکی و ملی مسئلہ پر کھلکر گفتگو کا موقع ملا، عاجز نے خوب خوب سوال کیے، اور وہ میری تسکین و تشفی کے ساتھ معلومات میں اضافہ فرماتے رہے، دہلی جا کر میں نے مولویوں اور ان کے علم کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اس میں کچھ ترمیم کی ضرورت محسوس ہونے لگی، وہ بار بار یہی فرماتے رہے "اب تمام توقعات تم ہی لوگوں سے ہیں آؤ، اور یہاں رہ کر کچھ کام کرو۔"

غالباً گرمیوں کا موسم تھا، اور نمک کی تحریک چل رہی تھی، چھٹیوں میں راقم بھی وطن آیا ہوا تھا، مولانا ایک وفد کے ساتھ بہار شریف تشریف لائے، مولوی منظر علی ندوی (مرحوم) اور پروفیسر عبدالباری بھی ساتھ تھے، جامع مسجد میں جلسہ ہوا، مولانا نے دو گھنٹے تقریر کی، سارا مجمع پتھر کی مورت بنا ہوا تھا، میں نے اپنی زندگی میں خطابت اور اس کی تاثیر کا بالکل نیا نمونہ دیکھا

زبان میں لکنت، بیان میں سادگی، نہ ابوالکلام کی خطابت، نہ بخاری کے چٹخارے، نہ احمد سعید کی زبان، مگر مجمع ہے کہ دم بخود ہے اور ہاں ہاں کر رہا ہے اور مجمع بھی کیسا، تحریک کے مخالفوں کا! میں بار بار مولانا کی طرف حیرت سے دیکھتا تھا اور دل میں ان کی عظمت بیٹھتی جاتی تھی۔ اس تقریر سے میری معلومات میں بڑا اضافہ ہوا اور (لاتلقوا بایدیکم الی التہلکۃ) کے شانِ نزول سے پہلی مرتبہ کان آشنا ہوئے۔

۳۲ء کے آغاز میں راقم نے "الضیاء" (عربی ماہنامہ) نکالنا شروع کیا، تو مولاناؒ نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، رسالہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا اور وہ ایک نظر اس پر ضرور ڈال لیتے لکھنؤ تشریف لاتے تو خادم کو ضرور پوچھتے۔ مسلم یونٹی بورڈ کے جلسے غالباً ۳۲ء کے اواخر میں ہوئے اور اس سلسلہ میں مولاناؒ کا لکھنؤ میں ہفتوں قیام رہا، اس دوران میں راقم برابر حاضر ہوتا، اور ان کے افادات سے اپنی کم مائگی دور کرنے کی کوشش کرتا۔ مولانا ہی کی نوازش سے راقم یونٹی بورڈ کے مجلس مضامین میں برابر شریک ہو سکا، اور حقیقت میں یہی یونٹی بورڈ کے جلسے تھے جہاں مولاناؒ کے سیاسی تدبر کا لوہا موافق و مخالف سب ماننے پر مجبور ہوئے، یوں کہئے کہ جمعیۃ کی پوری مجلس انتظامی موجود تھی، بورڈ میں اس کے نمایندے بھی موجود تھے، پر دماغ ایک تھا اور سب جسم محض کی حیثیت رکھتے تھے مولاناؒ لکھواتے، نوٹ کرائے جاتے اور ایک انگریزی داں[1]، بورڈ کے

---

[1] ہلال احمد صاحب زبیری سابق مدیر الجمعیۃ۔

سامنے ان کی ترجمانی کرتا، اور ساری مجلس عاملہ حاضرین کا منہ دیکھا کرتی۔ یونیٹی بورڈ کے مشورے لکھنؤ میں دوسری مرتبہ مسلسل تین روز تک ہوتے رہے جس میں سارا اسلامی ہند کا عطر کھینچ کر آگیا تھا قابل ذکر شخصیتوں میں صرف علامہ اقبال مرحوم نہیں تھے، خالص قانونی نوعیت کی شقوں سے لیکر ٹھیٹھ فقہی مسائل بھی بساط بحث پر آجاتے۔ پورے مجمع میں دو شخصیتیں سب پر بھاری تھیں ایک ظاہری طور پر باوقار اور وجیہہ، صدر کی بغل میں کرسی نشیں ہوتا اور دائیں بائیں اس کے دو وزیر (ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی) اپنی جگہ لیتے۔ میرا اشارہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہٗ کی طرف ہے اور دوسرا ظاہری طور پر خستہ حال، ایک کنارے معمولی لباس میں کاغذوں کا ایک بستہ لیے ہوئے لکھنے لکھانے میں منہمک ہوتا۔ میری مراد مولانا مرحوم سے ہے۔ مولانا ابوالکلام صرف ہدایات (DIRECTIONS) دیتے، آصف علی صاحب مسودہ تیار کرتے اور ہمارے مولانا سب کچھ خود ہی کرتے۔ البتہ زبان کی لکنت کے باعث اپنا ترجمان ہلال احمد صاحب زبیری کو بناتے۔ مشوروں میں بسا اوقات قاضی سید احمد حسین صاحب بھی شریک ہوتے بڑے بڑے شیریں مقال بیرسٹر اور لیڈر ان دونوں بزرگوں کی طرف دیکھتے، ان کی نکتہ آفرینیاں سنتے اور انگشت بدنداں رہ جاتے۔

سنہ ۴۳ء کی گرمیوں کا واقعہ ہے۔ لکھنؤ سے وطن آرہا تھا، درمیان میں دوچار گھنٹوں کے لئے پٹنہ اتر پڑا، حسب معمول اسٹیشن سے سیدھے بھائی منظر علی ندوی مرحوم کے گھر کا رخ کیا

راستہ ہی میں منظر مرحوم بدحواس ملے۔ میں نے پوچھا "خیریت"؟ بولے "پنہسہ جارہا ہوں۔ میں نے کہا "پنہسہ"؟ انہوں نے کہا "ہاں، حاسود (حسن سجاد) کا انتقال ہوگیا، مولانا کے ہاں تعزیت کو جارہا ہوں"۔ خبر کیا تھی، ایک بجلی، سر پکڑ کر رہ گیا۔ میرا بچپن کا کھیلا ہوا دوست اور بھائی، جس کی تقریب شادی رچائی جارہی تھی، وہ آن کی آن میں رخصت ہو گیا! مولانا کو تار پر تار دیئے گئے، لیکن قومی ضروریات پر اکلوتے نونہال کی قربانی انہوں نے خوشی خوشی گوارا کرلی، پہنچے بھی، تو اس وقت جب نوخیز ہونہار لڑکا اس دنیائے دنی پر آخری حسرت بھری نگاہیں ڈال رہا تھا۔ بار بار یہی سوچتا تھا کہ "مولانا کا کیا حال ہوگا؟ ان کی تو دنیا ختم ہوگئی"۔ دل میں آیا منظر صاحب کے ساتھ پنہسہ چلا چلوں، لیکن ہمت نہ پڑتی تھی —— ہفتہ عشرہ کے بعد استاذی مولانا عبدالحلیم صدیقی تعزیت کو تشریف لائے میں بھی بہار سے ساتھ ہولیا۔

مولاناؒ اپنی نشست گاہ میں تشریف رکھتے تھے، صدیقی صاحب لپک کر بغل گیر ہوئے، یہ خادم بھی اس سعادت میں شریک رہا۔ ہم لوگ (کم از کم راقم تو ضرور ہی) سراسیمہ تھے۔ لیکن مولاناؒ صبر و وقار کا مجسمہ نظر آئے، چہرہ زرد، قدم لڑکھڑا رہے تھے، پر زبان پر اُف نہیں، باتیں ہوتی رہیں، لیکن کیا مجال کہ مایوسی کی پرچھائیں بھی دکھائی پڑے۔ اللہ رے صبر! اور واہ رے ضبط!!

میں جب تک ندوہ میں رہا، نیازمندی اور استفادہ کا موقع بہت کم ملا، البتہ جب کبھی وہ لکھنؤ تشریف لاتے، خادم کو ضرور پوچھتے، کبھی کبھی خاص کر دارالعلوم تشریف لاتے، بسا اوقات

ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (ناظم ندوۃ العلماء) اور علی میاں (مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی) کی زبانی اطلاع ملتی کہ "مولاناؒ تمہیں پوچھتے تھے"۔۔۔۔۔ لیکن جب دسمبر ۳۷ء میں لکھنؤ چھوڑ کر پٹنہ آنا ہوا، تو پھر مولاناؒ کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کی نجی مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع ملا اور جوں جوں قربت بڑھتی گئی، محبت و عقیدت میں زیادتی ہوتی گئی۔ میں نہ کانگریس کا سرگرم حامی جمعیۃ العلماء کی پالیسی کا کامل مؤید، اور نہ امارت ہی کی کوئی ایسی خاص وابستگی تھی، پر مولاناؒ میں جانے کیا بات تھی کہ دل ان کی طرف بے اختیار کھنچتا تھا۔ اب تک جن لوگوں سے ملا، دو چار مستثنیات کو چھوڑ کر تعلقات کی زیادتی سے بدگمانی ہی بڑھی، بڑے بڑے عالموں کی مجلسوں میں جا کر بیٹھا، بعضوں کے نام سن کر دور دراز کے سفر بھی کئے، پر نزدیک جا کر معلوم ہوا کہ "ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی"، لیکن مولاناؒ کا حال اس سے بالکل جدا تھا، ان سے پہلی نظر میں بُعد محسوس ہوتا تھا دو چار ملاقاتوں میں جا کر ان کے ذہن و دماغ کی بلندی کا صحیح احساس ہو پاتا، اور اگر انہوں نے آپ کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا، پھر تو بے اختیار جی چاہتا کہ علماء اور زعماء کی ساری جماعت اس فرد واحد پر نچھاور کردی جائے۔ خوش نصیبی سے راقم بھی ان مخصوص نیازمندوں میں تھا جن سے مولاناؒ اپنے منصوبے بہت کم چھپاتے تھے، وہ بڑی سادگی سے بتایا کرتے کہ بساط سیاست پر تمام مہروں کو چھوڑ کر کس طرح پیدل شہ مات دی جاتی ہے؟ اور کب فرزیں دیگر کھیل شروع کیا جاتا ہے؟ میں یہ جانتا ہوں کہ اسی پٹنہ میں دو چار ایسے بزرگ بھی ہیں جن کے سامنے مولاناؒ اپنے وہ خاکے اور منصوبے بھی کھول کر رکھ دیتے تھے، جنہیں راقم جیسے تازہ واردان بساط ہوائے دل سے

بیان کرنا مناسب نہیں خیال کرتے، پھر بھی انہوں نے اس خادم سے مختلف صحبتوں میں جو کچھ اور جتنا کچھ بیان کیا ہے، کھول کر بیان کرنے کی کوشش کی جائے، تو نہ سننے والے تاب لا سکیں گے اور نہ کہنے والا ہی اپنے دل و دماغ کا توازن برقرار رکھ سکے گا۔

راقم کو آج کی صحبت میں نہ مولانا کے خدمات گنانا ہیں، اور نہ اُن کی سیاسی بصیرت اور علمی دقیقہ سنجی پر روشنی ڈالنا ہے، کہ یہ چیزیں اس مجموعہ کے دوسرے مضمونوں میں آگئی ہیں، اس تحریر میں صرف ان دھندلے نقوش میں رنگ بھرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو مرحوم سے ملنے اور اُن کی صحبتوں میں بیٹھنے کے بعد دل و دماغ پر مرتسم ہو گئے تھے۔ یہ نقوش بھی بہت ہیں اور ان میں باتیں کہنے اور سننے کی بھی بہت ہیں، پر ابھی، کہ داغ تازہ ہے، ضبط و تحریر کی بھی تاب نہیں، موقع ملا تو پھر کسی تقریب سے، تفصیل کی کوشش کی جائیگی۔ سردست اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوا رخصت ہوتا ہوں۔

خدمات

یادِ سجادؒ

(از جناب مولوی سید محمد مجتبیٰ صاحب ام۔اے۔بی۔ال، ارگنائزر محکمہ دیہات سدھار، بہار)

میں نے حضرت مولاناؒ کو پہلی مرتبہ ۲۱-۱۹۲۰ء کے عدم تعاون اور خلافت کے جلسوں میں بمقام بانکی پور دیکھا۔ مسٹر مظہر الحق مرحوم نے ایک کوٹھی قریب روڈو پرڈاک بنگلہ کے سامنے بنوانی شروع کی تھی مگر ابھی عمارت کرسی تک بلند ہوئی تھی اور کچھ دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں کلکتہ کے مخصوص اجلاس نے کانگریس کو عدم تعاون کا جنگی حربہ بخشا اور صوبہ بہار میں مسٹر مظہر الحق صاحب مرحوم نے اس تحریک کی قیادت کی۔ وہ زمین جو آج حسن امام صاحب مرحوم کا رضوان ہے مسٹر مظہر الحق صاحب مرحوم کی قیادت میں صداقت آشرم بنی ہوئی تھی۔ بانکی پور میں تحفے ابتدائی ہنگامہ خیز مجامع ہوئے وہ اسی موجودہ رضوان کی سرزمین پر۔ تحریک عدم تعاون کے انہی جلسوں میں حضرت مولاناؒ پہلی بار بانکی پور میں سیاسی پلیٹ فارم پر مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی مرحوم اور مولانا ابوالکلام کے دوش بدوش نظر آئے۔ حضرت مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ کا نام اس سے قبل تحریک خلافت کے ہنگاموں میں مشہور عالم ہو چکا تھا۔ لیکن اس وقت تک مولاناؒ مدرس اور عالم تھے۔ مدرسہ انوار العلوم گیا سے آپ کا تعلق باقی تھا۔ اب ۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون نے مولاناؒ کو خالص سیاسی رہبر بنا دیا۔

مولاناؒ ان سیاسی مجالس میں تقریر کم کرتے، مگر تجویزوں کی درستگی اور تہیہ با نقطہ نگاہ کی

وضاحت میں بہت کافی حصہ لیتے۔ اور یہی پہلو مولاناؒ کی سیاسی زندگی میں ہمیشہ فوقیت رکھتا تھا۔ یہ موقع ایسا نہیں کہ مولاناؒ نے صرف سیاسی تجویزوں کو مذہبی نقطۂ نگاہ بخشنے میں جو اہم سیاسی اور مذہبی خدمات کی ہیں ان کی تفصیل بیان کی جائے، اس خدمت کو ان کا سیرت نگار بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔ راقم السطور محض اس مضمون میں مولاناؒ کی سیرت کے ان نمایاں واقعات کو بیان کرا جاتا ہے جو ذاتی مشاہدہ میں آئے، ورنہ یہ بحر سیاست کا شناور اور مسلمانانِ بہار ہی نہیں، بلکہ مسلمانانِ ہند کا مذہبی رہبر اپنے کمالات علمیہ، وقوت عملیہ کے فیوض سے جو دولت لازوال اس پریشان حال جماعت مومنین کو دے گیا، اس کی قدر وقیمت کے لیے چشم بصیرت کی تلاش ابھی باقی ہے۔ مشیت ایزدی نے حضرت مولاناؒ کو حجاب قدس میں لے لیا مگر ہمیں یقین ہے کہ مسلمین ہند کے لیے مولاناؒ کی مشعل ہدایت ابھی عرصہ دراز تک مستقبل کو روشن کرتی رہیگی اور جنگ حریت کا خاکہ اُس سے آگے نہ بڑھ سکے گا جس کا نقشہ مولاناؒ کا سیاسی و مذہبی دماغ بنا کر چھوڑ گیا ہے۔

حضرت مولاناؒ نے سنہ ۱۹۲۰ء سے تا دم مرگ سیاسی آزادی کے لیے اپنے کو غایت انہماک کے ساتھ وقف کر دیا تھا، مولاناؒ نے سیاست اور مذہب کے اتحاد و اتصال کا نمونہ امارت شرعیہ بہار کو قائم کیا۔ یہ مولاناؒ کی زندگی کا عظیم الشان باب ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے، آئندہ مؤرخ کا قلم برسوں ان موشگافیوں میں مبتلا رہیگا کہ امارت شرعیہ کا محرک اصلی کون تھا اور ہندوستان میں امارت شرعیہ کا مستقل قیام کیوں وجود پذیر نہ ہو سکا اور

شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم کی عظیم شخصیت کے باوجود بھی امارت شرعیہ ہندیہ کا نظام نامہ مستقل لائحہ عمل اختیار نہ کر سکا، و نیز یہ کہ امام الاحرار حضرت مولاناؒ کی تحریک قیام امارت شرعیہ صوبہ بہار میں کیونکر بار آور ہوئی اور خود امام الاحرار بنگال میں جو ان کا آجتک مستقر ہے، صوبہ متحدہ میں جہاں لکھنؤ کے فرنگی محل سے سراج منیر کی جھلک آرہی تھی اور دہلی میں جہاں ان کا وطن ہے اور پنجاب میں جہاں کے مسلمان آج بھی دعویٰ قیادت اسلام رکھتے ہیں، امارت شرعیہ کا نظام قائم نہ ہوسکا، اور پھر یہ سبب بھی لائق تفتیش ہوگا کہ بہار ایسے صوبے میں جو اسلامستان ہند میں پست ترین صوبہ سمجھا جاتا ہے کن کمزور ہاتھوں نے امارت شرعیہ کا نظام قائم کردیا، جو آج بھی تمام خامیوں کے باوجود حیرت نگاہ بنا ہوا ہے اور جس نے مسلمانان ہند کے سامنے ہمیشہ مذہبی، سیاسی نقطہ نگاہ و پیرایۂ عمل کو بار بار تجربہ کر کے لائق تقلید بنادیا۔

جمعیۃ علمائے ہند کی تاریخ امارت شرعیہ سے اس طرح وابستہ ہے جیسے دو توام ہستیاں، اور اس رشتہ اتحاد خیال و عمل میں بھی صرف ایک واحد رُوح سرایت کر رہی تھی جو آج ہم سے رشتہ حیات توڑ چکی اور ہم واأسفا و وااسفا لکھ کر اپنا غم غلط کرنے پر مجبور رہ گیا۔

ان تمام شئون ماضیہ میں بس ایک رُوح جلوہ فرما تھی اور وہ "رُوح سجاد" تھی۔

حضرت مولاناؒ سے راقم الحروف کے تعلقات خصوصی اسی عہد امارت شرعیہ سے شروع ہوتے ہیں۔

حضرت مولاناؒ نے ایک عجیب دماغ پایا تھا، وہ غایت مذہبی اور سیاسی انہماک کے ساتھ ساتھ قانونی پیرایۂ عمل میں بھی بہترین قانون دانوں کے لیے رہبر خیال تھے۔ تحریک عدم تعاون اور خلافت کا دور شدھی اور سنگھٹن کے ہنگاموں میں غائب ہو گیا۔ اور قدرت نے انقلاب کے خوفناک عناصر کو منصۂ شہود پر باہم دست و گریباں کر دیا۔ حضرت مولاناؒ جہاں ہندو مسلم اتحاد کے شیدائی تھے، وہاں آپ کی زندگی کے یہ نمایاں خصوصیات تھے کہ آپ نے کبھی اصول اسلام کے برتنے میں مداہنت سے کام نہیں لیا۔ شدھی اور سنگھٹن کے ہنگامہ توہین میں مولاناؒ کی ذات گرامی ہی از اول تا آخر سربکف رہی اور یہ ایک دوسرا عظیم الشان باب مولاناؒ کی زندگی کا ہے جو مولاناؒ کے سیرۃ نگاری کی بہترین کوشش اور توجہ کا مستحق ہے۔ یہ وہ دور تھا، جو ۲۴-۲۵ء سے صوبہ بہار میں شروع ہوا اور ۳۰-۳۱-۳۲ء تک ہمہ گیر رہا۔ تحریک عدم تعاون اور خلافت کے مسلمان قائدین جو کانگریس سے اتحاد عمل پیدا کر چکے تھے، اب سر چھپانے لگے۔ لیکن ایک مولاناؒ کی ذات گرامی تھی جس نے امارت شرعیہ کے مبلغین کو صف جنگ پر سامنے لا کھڑا کیا، اور خود اس کی قیادت کی، حضرت امیر شریعت اول، و حضرت امیر شریعت ثانی نے حضرت مولانا سجادؒ کے دست و بازو ہی سے تمام فتنۂ ارتداد، شدھی، سنگھٹن اور فسادات متعلق قربانی گاؤ، جلوس، باجہ، انہدام مسجد، اغوا اور ہزاروں دیگر فسادات کا مقابلہ کیا، جو ہندو مسلم سیاسی اتحاد کو ملیامیٹ کرنے کے لیے تمام صوبے میں پیدا کئے گئے۔

بتیا کا خوفناک بلوہ، ایک ایسا واقعۂ ہائلہ تھا جس نے مولانا سجادؒ کی عظیم شخصیت کے

جو ہر دکھلائے۔ یہاں پر یہ اشارہ کرنا ضروری ہے کہ امارت شرعیہ نے چمپارن ضلع اور بتیا تحصیل میں جاہل غریب مسلمانوں میں بہترین تنظیم کی ہے' جو آج بھی لائق رشک ہے۔

بتیا شہر میں ایک محلہ میر شکار ٹولی کہلاتا ہے۔ باختلاف روایت چالیس پچاس ہزار ہندوؤں کا مسلح جلوس اس محلہ کی تنگ سڑکوں سے گذرنے لگا' جہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں تیس چالیس مسلمان نماز عصر ادا کرنے کو جمع ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے عذر کیا کہ جلوس کا وہ راستہ نہ تھا۔ آبادی محلہ کی خالص مسلمانوں کی تھی۔ سرداران جلوس نے اس مزاحمت کا جواب مسلح حملوں سے دیا۔ مسجد بُری طرح بے حرمت کی گئی' تمام محلہ جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ اور شہر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان عام بلوہ ہوگیا' ہتھیار عام طور پر استعمال ہوئے بندوقیں چل گئیں' سینکڑوں مکانات اور دکانیں لٹ گئے۔ مسلمان بہت زیادہ مقتول ہوئے۔ ایک ہندو بھی مارا گیا اور وہ سب کچھ ہوا جو ایسے بلوؤں میں ہوا کرتا ہے۔

بتیا کے مسلمان عموماً جاہل' غریب اور مزدور پیشہ ہیں' اُن کا پرسانِ حال اور پیروی کار کوئی نہ تھا۔ یہی بطل حریت اور رہبر عالم اسلام' مسلمانانِ بتیا کے لئے ملجا و مامن بن کر پہنچا۔ مدرسہ اسلامیہ بتیا میں امارت شرعیہ کے آزمودہ کار نقیب و رئیس حافظ محمد ثانی[۱] صاحب

---

[۱] حافظ محمد ثانی صاحب ام۔ ال۔ اے اور شیخ عدالت حسین صاحب' مولانا مرحوم کے مخصوص رفیقوں میں تھے' اور آخر تک ساتھ رہے۔ مسلمانان چمپارن کے ہر درد دکھ میں یہ حضرات سینہ سپر رہتے ہیں۔ 'م' ع'

وشیخ عدالت حسین کی مدد سے مولاناؒ نے پیروی مقدمات کا دفتر کھول ڈالا۔ بہترین قانون داں حضرات باہر سے بلوائے گئے، اور تقریباً ایک سال تک تمام مقدمات کی پیروی کی گئی۔ دنیا جانتی ہے کہ بلوے کے ایسے خوفناک مقدمات کیا ہوتے ہیں۔ قانون کی چیرہ دستیاں کس طرح لوگوں کو پریشان کرتی ہیں۔ تمام شہر اور مضافات ایک عجیب مصیبت میں مبتلا تھے اور مولانا سجادؒ ان کے ہر مرض کی دوا۔ تین سو سے زیادہ مسلمان ماخوذ تھے، جن پر تمام سنگین دفعات عائد کیے گئے تھے، مگر بالآخر ایک ایک مسلمان رہا ہو کر رہا۔ کچھ ہندو سزایاب ہوئے بر عکس ہندوؤں کو سخت سخت سزائیں ہوئیں مسلمانوں کو تقریباً پچاس ہزار تاوان حکومت نے دلوائے۔ راقم الحروف تقریباً ایک سال تک مولاناؒ کے ہمراہ بطور قانونی مشیر رہا، اس مضمون کے مختصر حدود اجازت نہیں دیتے کہ اس سال بھر کی زندگی کو مفصل بیان کر سکوں، مگر اتنا کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اصحاب رسولؐ اور قرن اول کے مجاہدین اسلام کے متعلق جو کچھ کتابوں میں پڑھا یا سنا تھا، وہ سب ایک مولاناؒ کی ذات گرامی میں بچشم خود دیکھا ۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

مولاناؒ نے حکومت بہار کے ایوان گورنری سے لیکر ایک ایک ادنیٰ افسر متعلقہ پر مسلمانوں کی بے جرمی اور مظلومیت کا نقشہ بٹھانے میں جو سعی کی ہے اس کا بیان کامل ابھی تشنۂ وقت ہے۔ مولاناؒ نے اس حادثۂ عظیم پر جو اول مراسلہ بہار کے گورنر کے پاس

بھیجا اس کا مسودہ خود تیار کیا تھا' اور اس خادم کو انگریزی ترجمہ کے لیے مرحمت فرمایا؛ یہ پہلا موقع تھا کہ اس خادم کو مولاناؒ کی تحقیق و تلاش اور فراست قانون کے حیرت انگیز قوائے عقلیہ و دماغیہ و علمیہ کا علم ہوا۔ مراسلہ مذکور کی ایک نقل آج بھی محفوظ ہے اور اس کا مطالعہ مولاناؒ کے سیرت نگار کے لیے' ایک مخزن واقعات ہوگا۔

تمام حکام پولیس' مجسٹریٹ اور گورنر کے کونسل کے ممبران' بتیا کو اپنا مستقر بنا کر مصروف تحقیقات تھے۔ مولاناؒ نے جو دفتر تحقیقات قائم کیا تھا' اور وہاں جو کام مولاناؒ کی ہدایت سے کیا جاتا تھا حکومت اس کو جاننے کو بے قرار رہتی اور آپ یہ جان کر تعجب کریں گے کہ حکومت نے مولاناؒ کے طریقۂ تحقیقات کی بارہا تقلید کی۔ اس قسم کا ایک مشہور واقعہ تصویر کشی کا ہے' مولاناؒ نے قانونی ضرورتوں کے لیے تمام مقامات متعلقہ کے فوٹو تیار کرائے' ایک فوٹو گرافر باضابطہ مقرر کیا گیا اور کام جاری ہوگیا۔ پولیس کے افسران حیرت سے پوچھتے کہ اس میں کیا غرض پنہاں تھی۔ بالآخر پولیس نے بھی فوٹو لینے شروع کیے۔ آپ بس اتنا ہی سن کر اکتفا کریں کہ دفعہ ۳۰۲ تعزیرات ہند یعنی قتل عمد کا جو الزام مسلمانوں پر تھا' اس مقدمہ میں زیادہ کامیابی فوٹو کی وجہ سے ہوئی جس کو دکھلا کر گواہوں سے اس طرح جرح کی گئی کہ اُن کا کذب ظاہر ہوگیا' اور مسلمان بے داغ بری ہوگئے۔

باوجود انتہائی اتحاد عمل کے مولاناؒ نے شدھی' سنگھٹن اور ارتداد کے قضیوں میں ہرگز کانگریس یا مہاسبھائی ہندوؤں کی دوستی کو مداخل نہ بنایا اور سینہ سپر ہو کر محافظت اسلام

کے لئے آخر وقت تک قربانیاں کرتے رہے۔

انہی واقعات میں سے گورکھپور اور چمپارن ضلعوں کے مسلمان گدیوں کا ارتداد ہے۔ گدی ان اضلاع میں مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جو مویشیوں کے پالنے اور دودھ، دہی، گھی کی تجارت کا روزگار کرتے ہیں، یہ مسلمان گوجر، گوالے یا اہیر ہیں، یہ غایت درجہ جاہل اور توہم پرست تھیں۔

ان مسلمان گدیوں کی تنظیم بھی مولاناؒ کی محیر العقول تنظیمی قوت کا نمونہ تھا۔

اس دور کے خدمات میں چوترواضلع چمپارن کے ڈوموں کی تبلیغ بھی ہے۔ قوانین موجودہ نے جرائم پیشہ اقوام کی اصلاح کے لئے ایک مخصوص و محدود آبادی ضلع چمپارن اور دیگر اضلاع میں قائم کرنے کی کوشش کی ہے جس میں چوتروا کی آبادی نہایت ممتاز ہے۔ جرائم پیشہ اقوام میں مگہیا ڈوموں کی کثیر تعداد یہاں آباد ہے جن کی اصلاح کا کام عرصہ سے مسیحی تبلیغی ادارے کیا کرتے تھے۔ حضرت مولاناؒ کی تحریک پر مبلغین امارت کو ان بدنصیب جماعتوں کی اصلاح و تبلیغ کے لئے بھیجا گیا۔ حکومت کے افسران اور مسیحی مبلغین سے جو "سالویشن آرمی" یا مکتی (نجات دہندہ) فوج کہلاتی ہے، اختلافات پیدا ہوئے، بالآخر مولاناؒ کی جدوجہد سے حکومت نے یہ حق تسلیم کرلیا کہ ان جرائم پیشہ ڈوموں کی اصلاح کا حق ہندو مسلمان سب کو ہے۔ اس عرصہ میں مبلغین کی کوششوں سے تقریباً ایک سو خاندان مسلمان ہوچکے تھے۔ مسلمان مبلغین کو حکومت نے اجازت دی کہ وہ ان مسلمان ڈوموں کی مذہبی تربیت کریں۔ اخبارات میں جو مراسلے مولاناؒ کے شائع ہوئے اس سے آریہ مبلغین نے بھی زور و شور سے ان جرائم پیشہ اقوام کی اصلاح میں پرجوش حصہ لینا شروع کیا۔

اس سلسلہ کی ایک اصلاح مولاناؒ نے چمپارن ضلع کے ابتدائی اسکولوں اور پاٹھ شالوں میں کی، جہاں مسلمان بچوں کو ہندی کی تعلیم دیجاتی تھی اور بجائے قرآن کے گیتا پڑھایا جاتا تھا، مولاناؒ نے دفتر تعلیمات سے کافی مراسلات کئے اور ابتدائی مکاتب کا معائنہ کرکے من وعن حالات حکام بالا کو پہنچائے۔ متعصب افسران ماتحت کو بدلوایا اور مسلمان بچوں کی تعلیم مذہبی کا نظم کرایا اور بکثرت اردوداں مسلمان معلم مقرر کرائے۔

آج مسلمانوں کے سیاسی اختلافات نے کتنی تنگ نظری پھیلادی ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت نے مرنے والے کو بہت زیادہ مطعون کیا کہ وہ ہندو پرست تھے، کانگریس کے غمخوار تھے۔ اور اصول اسلام کو ہندوؤں کی خوشنودی پر فروخت کرتے تھے۔ عیاذاً باللہ! فردائے قیامت میں خداوند قدوس کے سامنے ہزاروں کلمہ گو اس امر کی یقینی شہادت دینگے کہ یہ بندۂ خدا، ابوالمحاسن محمد سجادؒ بیس سال تک اس صوبہ میں کم از کم تنہا مجاہد اسلام وحریت تھا جس نے سنت محمدیؐ کے اجراء اور اصحاب رسول کے نقش پر چلنے میں اپنی جان گنوائی۔ دنیا کی کوئی حرص نہ تھی جس سے یہ ذات گرامی ملوث ہوئی، فقر وفاقہ اس کا مسلک تھا۔ دعوتِ عمل اس کی گفتار تھی اور وہ سراپا تمسک بالاسلام پر قدم زن تھا۔ ذہاب فی سبیل اللہ اس کی حیات دنیاوی کی تصویر تھی، مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی تنظیم میں اس ذات گرامایہ نے ایک ایک لمحۂ حیات صرف کیا اور دنیا کی کوئی طاقت اس کو مرعوب نہ کرسکی، وہ تنگ نظر نہ تھا کہ ہمسایہ اقوام سے اتحاد عمل کرتے ہی جی چراتا۔ وہ طالب جاہ نہ تھا کہ مسند حکومت پر جلوہ فرما ہوکر مظاہرہ وتقابلہ کرتا۔

اس کی زندگی سراپا جہاد تھی، اور وہ خالص مجاہد اسلام تھا۔

بتیا کے بلوے نے حضرت مولاناؒ کے قوائے عقلیہ و عملیہ کو حکومت اور پبلک دونوں کے سامنے انتہائی کمال کے ساتھ دکھلایا اور نظام امارت شرعیہ کو صوبہ بہار میں نہایت درجہ مستحکم کردیا۔ مبلغین امارت کی وقعت ہر گوشہ میں پیدا ہو گئی اور کم از کم اضلاع ترہت میں مسلمانوں کو اس ادارے پر کامل بھروسہ ہو گیا۔

یہ زمانہ ایسا تھا کہ ہر ضلع اور ہر تحصیل میں ہندو مسلم فسادات رونما ہو رہے تھے۔ عید قربان اور درگا پوجا، ہولی اور مہابیری جلوس کے موقعے بلووں کے خطرے کیلئے نہایت پریشان کن ہوئے۔ بتیا کے بلوے کے بعد ہی مظفر پور ضلع میں، پاتے پور تھانہ کے موضع سمروارہ میں قربانی گاؤ کے لئے ہندوؤں نے ایک غریب مسلمان کو شہید کردیا اور بہتیرے غریب مسلمانوں کو جو اس بستی میں آباد تھے، لوٹ لیا۔ اس علاقہ کے قریب ہی دربھنگہ ضلع کے دیہات مسمی سرسونہ میں بقرعید ہی کے موقع پر دوسرا بلوہ ہوا جس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں کو لوٹ لیا۔ یہ دو مقدمے بھی کامیابی کے ساتھ لڑے گئے اور حضرت مولاناؒ کی جدوجہد برابر شامل حال رہی۔ اس مضمون کا محدود پیرایۂ بیان اس کی اجازت نہیں دیتا کہ واقعوں کی تفصیل کی جائے۔ صرف اس نتیجہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ حضرت مولاناؒ کا اصول عمل ہر واقعہ میں بین طور پر ظاہر ہو جاتا۔ نظام امارت نے باوجود مالی بے مائگی کے ہر موقعہ پر، مسلمانان بہار کی مذہبی آزادی برقرار رکھنے کی کوشش کی، مسلمانوں کی مذہبی آزادی پر

جب کبھی حملے ہوئے تو حضرت مولاناؒ نے بحیثیت نائب امیر شریعت مسلمانوں کی مذہبی آزادی کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہو کر حکومت اور برادران وطن کا مقابلہ کیا اور ایسی جد وجہد کی کہ ہر مرتبہ ظالموں کو سزایاب کرایا اور حکومت سے انصاف کا مطالبہ کر کے خاطر خواہ طور پر قضیوں کو طے کرایا۔ قربانی گاؤ، جلوس اور مساجد و مدارس، مکاتب و اوقاف ان تمام چیزوں کی نگرانی پورے صوبے میں ایک مولاناؒ کی ذات سے وابستہ تھی اور مبلغین امارت اسی مرکز کے گرد گھومتے تھے

ان تمام واقعات ہائلہ نے حضرت مولاناؒ کو صوبہ بہار کے گوشہ گوشہ سے وابستہ کر دیا۔ ہر علاقہ کے مسلمان ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل اور تعلیم یافتہ آپ سے واقف اور آپ کی عظیم شخصیت سے متاثر ہو گئے، یہی وہ زمانہ تھا جبکہ حج کے متعلق قوانین نافذ ہونے لگے اور والسرائے کی حکومت نے حج بل کے مسودات پیش کئے، حاجیوں کی واپسی ٹکٹ، جہازوں کے تعین، حاجیوں کے خوراک، معلمین کے لائسنس وغیرہ کے مسائل زیر بحث آگئے اور در پردہ سیاسی قضئے پیدا ہو گئے یہ باب مولاناؒ کی زندگی کا ایسا اہم ہے کہ مولاناؒ کا سیرت نگار ابھی برسوں غور کریگا کہ واقعات کی گتھیوں کو کیوں کر سلجھائے، ایک واقف کار نے بہت ہی خوب کہا کہ "حضرت مولانا سجادؒ کی سیرت لکھنے کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ دن اور انتظار کیا جائے تاکہ کچھ شخصیتیں اور بھی عالم فنا کو منتقل ہو جائیں ورنہ خوف ہے کہ سیرت نگار کا قلم شخصی جھگڑوں میں پھنس جائیگا۔" یہی وہ عہد ہے جبکہ مولاناؒ ہندوستان کی بعض عظیم مسلم شخصیتوں سے مقابل ہوئے اور محافظت اسلام کے لئے آپنے اعلائے کلمۂ حق میں بیباکانہ جرأت سے کام لیا۔ مولاناؒ نے امیر شکیب ارسلان کی کتاب حاضر العالم الاسلامی اور

عالم کو ان سیاسی زعمائے ملت کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ اکثر مواقع پر بہترین مشیر اور رہبر دیکھا تو وہ مولانا سجادؒ ہی کی ذات تھی۔

دُنیا یہ جانتی ہے کہ مسلم کانفرنس نے کچھ اصولی مطالبات حقوق کے متعلق بنائے لیکن یہ راز اب تک سربستہ ہے کہ حقوق مسلم کی تعریف کسی نے بتائی' اس کی حد بندیاں کس نے کیں؟ اور کس طرح وہ مخصوص حقوق تجویز کی شکل میں فرداً فرداً شمار کرکے دُنیا کے سامنے پیش کیے گئے؟ مسلم کانفرنس کی مجلس مضامین میں مولاناؒ مرحوم نے وہ تجویز جو حقوق مسلمین کو محدود و متعین کرتی ہے کافی بحث و تمحیص کے بعد مولانا محمد علی مرحوم کی استدعا پر قلمبند کرکے دی اور موخر الذکر بزرگ نے اس کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔

یہ محدود تجویز مسلم کانفرنس کی طرف سے سائمن کمیشن کے سامنے پیش ہوئی اور پھر کچھ دنوں بعد دوسری گول میز میں پیش کی گئی' اور نئے قالب میں مسٹر محمد علی جناح کے "چودہ پوائنٹ" میں آگئی۔ اس میں مولاناؒ نے اقلیت کے مسائل' خصوصاً مسلمانوں کے پرسنل لا کے متعلق قوانین سازی کے متعلق یہ اصول وضع کیا کہ جب تک مسلم نمائندگان کی اکثریت کسی بل پر متفق نہ ہو' وہ بل قانون نہ بن سکے۔ ہمارے مطالبات آج بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھے۔

چند ہی سال بعد ۳۵ء میں مرکزی اسمبلی کا انتخاب درپیش ہوا اور مولاناؒ نے جمعیۃ علما اور امارت شرعیہ کو میدان میں لا کھڑا کیا اور دُنیا نے یہ تماشا دیکھا کہ مدرسوں اور خانقاہوں کے بوریہ نشین سیاست کی نئی گتھیاں سلجھانے لگے۔

مسلمان انگریزی داں طبقہ نے مولاناؒ کی اس جرأت کو ناقابل معافی سمجھ کر سخت مخالفت کی اور اس مخالفت کا ممتاز واقعہ مولوی شفیع داؤدی صاحب کا مقابلۂ انتخاب تھا۔ ایک محدود جماعت انگریزی دانوں کی مولانا سجادؒ کے ہمراہ بھی تھی۔ لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اکثریت آخر تک مخالف رہی اور مولوی شفیع الکشن میں کامیاب ہوئے، مولانا سجادؒ نے الکشن کو خلاف قانون قرار دینے کے لئے مقدمہ دائر کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الکشن ٹریبونل کی تحقیقات مولوی شفیع داؤدی کی موافقت میں ہونے کے باوجود وائسرائے نے انتخاب مسترد کردیا۔ یہ داستان ابھی ہماری یاد سے محو نہیں ہوئی۔

'امارت الکشن بورڈ' کا مینی فسٹو (منشور) اور الکشن کے نتائج نے دو امر واضح کردیا۔ اوّل تو یہ کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے وقت ایک سیاسی مدبر نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ "یہ جنگ اور خاصکر عالم اسلام کی کشمکش ایسا واقعہ ہے کہ خانقاہوں کے حجروں میں رہنے والے اپنا سجادہ و تسبیح چھوڑ کر میدان سیاست میں اُتر آئیں گے اور دیوبند اور ندوۃ العلماء کے بوریہ نشیں مسلمانوں کی مذہبی جماعتوں کو میدان میں لا کھڑا کریں گے"۔[1] ۳۵ء میں یہ جماعت علما و مشائخ کی سیاست میں عملی حصہ لینے کے لئے پریشان نظر آنے لگی۔ اور دوسری طرف انگریزی داں طبقہ کو اپنے سیاسی

---

[1] یہ پیشین گوئی غالباً مسٹر مارلیسن (سابق پرنسپل ام۔ اے۔ او کالج علی گڈھ) کی ہے، جسے اسٹانڈرڈ نے بھی نقل کیا ہے۔ 'م'ع'

لائحہ عمل پر از سرِ نو غور کرنا پڑا۔ ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ کامل فیصلہ کیا جائے کہ کون صراطِ مستقیم پر تھا اور ہے، مگر عالم تلاطم میں طوفان کا شور اور سمندر کا مدوجزر، ہر آنکھ کے سامنے عریاں ہو گیا۔

وہ جو صاحب عزلت تھے میدان میں کود پڑے، اور وہ جو طالب سکون تھے حجروں میں جا چھپے۔

۱۹۳۵ء کے قانون کو قبول یا رد کرنے کے ہنگامے، اور ۱۹۳۶ء کا صوبہ وار الکشن مولانا سجاد علیہ الرحمۃ کی رہبری کا یکساں ممنون ہے۔ مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی، اور مسلم یونائیٹڈ پارٹی، اور احرار پارٹی کی انتخابی سرگرمیاں، مولانا سجادؒ کی سیاست و تدبر کے لئے ایک نئی اور شاید آخری آماجگاہ بن گئیں۔ مولاناؒ کی مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی اکثریت کے ساتھ انتخاب میں کامیاب ہوئی اور مسٹر محمد یونس پارٹی لیڈر کی عارضی سہ نیم ماہی وزارت بھی مولاناؒ ہی کی زندگی کا ایک ممتاز باب ہے، جس کی کم از کم ایک درخشاں یادگار اردو زبان کا عدالتوں اور دفتروں میں جاری کرنا ہے۔ آپ اس وزارت کے متعلق جو کچھ بھی رائے رکھیں، اس پر بحث کا یہ موقع نہیں۔ اس کلیہ سے کم اختلاف ہو گا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا اصل سیاسی مقصد حاصل کر لیا۔ اور ایک انقلاب عظیم ہندوستان کی سیاست میں برپا کر دیا۔ مسلمانوں کی مذہبی جماعت نے سیاست میں غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ انتخابات میں حصہ لیے، کامیابیاں، نمایاں اور ممتاز کامیابیاں حاصل کیں، اور ان تمام امور میں جن کو مذہبی مسائل سے تعلق ہے، مذہبی جماعت سے استصواب رائے کرنے کے اصول کو منوالیا۔

مولانا جادۂ حریت کے ایک مسافر تھے، اور اپنا سفر ختم کر کے منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ اب راستے درست ہو گئے، منزلیں مقرر ہو گئیں۔ آرائش و آسائش کے سامان بہم پہنچائے جائیں گے، اور

مالِ غنیمت کے حصّے بخرے کرنے کے لئے جھگڑے ہوں گے، مگر جادۂ عمل کی تاریکی غائب ہو چکی اور وادیِ مقصود کی خاردار جھاڑیاں کٹ چکیں، اب صرف شہسواروں کی یکہ تازی منتظرِ نگاہ ہے،

وہ کونسا شہسوار ہے جس نے ٹھوکریں نہیں کھائیں؟ مگر صد ہزار آفریں ہے اس رہ نوردِ پر جو راہ کی تاریکی اور خطرناکی سے کبھی نہ گھبرایا، اور ہمسفروں کی قلت سے کبھی اس کا دل ملول نہ ہوا۔ جس کو سامانوں کی کمی نے کبھی فکرمند نہ کیا اور جس نے مصیبتوں کے پہاڑ جھیلنے میں کوتاہی نہ کی، خدا کی رحمت ہو اُس فرشِ خاک پر، جہاں وہ ابدی راحت میں منتظرِ قیامت ہے۔

علمائے اسلام کی جماعت آئندہ مولاناؒ کے افکار و ہدایات کی کیا تاویل کریگی؟ یہ کہنا مشکل ہے، مگر آج تو اس کو یہ اعتراض بخوشی قبول کر لینا چاہیئے کہ کم از کم صوبہ بہار میں اور یو۔پی اور دہلی و پنجاب تک مولانا سجادؒ نے علماء کے تفوق کے لئے آخر لمحہ تک جہاد کیا۔ اسلام کے قرنِ اول سے لیکر آجتک مذہبی جماعت کے تفوق کا مسئلہ دیگر ادیان و ملل کی طرح باعثِ نزاع رہا اور تاریخ کے صفحات ایسے خونین داستانوں سے بھرے ہیں، اگر ہندوستان کی سیاسی پامالی کے بعد اس اُبھار کی کوئی اُمید باقی نہ تھی، مولاناؒ نے اپنی جد و جہد سے یہ ثابت کر دیا کہ اس خاکستر میں ابھی کتنی آگ باقی ہے، جو اگر قابو میں نہ رکھی گئی تو ایک عالم کو خاک کر دے سکتی ہے۔

مولاناؒ کی زندگی کیا تھی؟ سراپا فقر! آپ کا عمل کیا تھا؟ جہاد فی سبیل اللہ، احیائے سنت اللہ، و اعلائے کلمۃ اللہ۔ سامانِ زندگی اتنا مختصر کہ غربت بھی شرمائے، ارادے ایسے بلند کہ بلندی کو شرم آئے، گھر اور گھر کی تمام بضاعت اپنے مقصد پر قربان کر چکے تھے، پھلواری شریف کے قصبہ

"ناجیہ" میں غلامی سے نجات پانے کے لئے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ جب امارت شرعیہ کا دفتر قائم ہوا، پھلواری ہی جائے سکونت قرار پائی۔ تقریباً بتیس سال سے پاؤں میں چکر تھا، کبھی چین کے دو دن یہاں بھی نصیب نہ ہوئے۔ کچھ دنوں سے جمعیۃ علمائے ہند کے دفتر کو سنبھالنے کے لئے دہلی میں زیادہ رہنا ہوتا تھا۔

ذاتی حیثیت سے مولاناؒ سراپا توکل تھے، عسرت کی زندگی بخندہ پیشانی بسر کرتے۔ خاندان کی کاشت کا معتد بہ حصہ امانواں راجہ کے بقایا لگان میں نیلام کرالیا تھا۔ ایک وسیع مکان خاندان کی رہائش کا موضع پنہسہ، تھانہ دیپ نگر، تحصیل بہار شریف (ضلع پٹنہ) نالندہ روڈ اسٹیشن کے قریب ہی ریلوے لائن سے متصل تھا، جس کے اکثر حصے غیر مرمت اور منہدم ہو گئے ہیں۔

مولاناؒ کس درجہ رضائے الٰہی پر شاکر تھے، اس کا ایک واقعہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مولانا کا ایک جوان لڑکا دیوبند میں تعلیم پا رہا تھا، جو خاص مولانا حسین احمد صاحب کے زیر درس تھا، وہی ایک چراغ خانہ تھا جو سنت ایزدی سے ۱۹۳۲ء میں غالباً گھر پر سخت بیمار پڑا۔ مولانا سجاد علیہ الرحمۃ مولانا احمد سعید صاحب کے ہمراہ اضلاع ترہت میں دورہ کر رہے تھے، تار پر تار گئے۔ اس لڑکے کی حالت خطرناک ہو گئی اور وہ انتقال کر گیا۔ مولاناؒ اس وقت تک سفر ملتوی کرنے پر مائل نہ ہوئے جب تک خطرناک حالت اور ناامیدی کی اطلاع نہ ملی۔ اس حال میں بھی مولاناؒ نے جس صبر کا ثبوت دیا اس کی مثالیں عنقا ہیں۔ جن لوگوں نے مولاناؒ کو اس وقت دیکھا ہے وہ اس کی شہادت دیں گے کہ مولاناؒ نے کس ضبط و صبر سے راضی برضا رہ کر اسلام کی بہترین تعلیم کا نمونہ دکھلایا۔

کتب بینی مولانا کا بہترین مشغلۂ فرصت تھا۔ کثرت مطالعہ سے آنکھیں بہت کمزور ہو گئی تھیں اور ۱۹۴۳ء میں آنکھوں کی تکلیف بہت زیادہ ہو گئی تھی مگر مطالعہ کا شوق ویسا ہی باقی تھا، اس مختصر سے مضمون میں مولاناؒ کے ذوق مطالعہ کی وسعت کو بیان کرنا ممکن نہیں، اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ وسعت مطالعہ کا یہ حال تھا کہ مسائل حاضرہ کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جس پر مولاناؒ نہایت تحقیق و تدقیق سے گفتگو کرنے اور حل کرنے پر قادر نہ تھے۔

کانگریسی لیڈروں سے اور اس کے اداروں سے مولاناؒ کے تعلقات ہمیشہ بے لوث رہے اور ایک مثال بھی ایسی نہیں مل سکتی جس میں مولاناؒ کا دامن اغراض ذاتی سے وابستہ ہوا ہو۔ مخالفین کے اعتراضات جن بدگمانیوں پر منحصر ہوں، ان کی تحقیق کا تو موقع نہیں، مگر مخالفین خود بھی اپنی بدگمانیوں کی کوئی بنیاد آج تک نہ بتا سکے ــــ کانگریس کے ساتھ مصلحتاً اتحاد عمل مولاناؒ کا کھلا ہوا تدبر تھا، اور عملی طور پر جب اسلامی حقوق کی محافظت کانگریس کی مخالفت کی داعی ہوتی، تو مولاناؒ کانگریس کی مخالفت سے کبھی باز نہ آتے، یہی وہ اصول عمل تھا جس کی وجہ کر ان کی ذات گرامی سے کانگریس مرعوب بھی تھی اور خائف بھی ــــ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ مولاناؒ کانگریس یا ہندوؤں سے مرعوب تھے، وہ ان حقائق پر غور کریں جو عارضی وزارت بنانے اور اُس بیان کے شائع کرنے میں پوشیدہ تھے جو بت پرستی کو برداشت کرنے اور مسٹر کرپلانی کے خط فلسفۂ گاندھی ازم کے جواب میں لکھا گیا۔

ہمیں اُمید ہے کہ جب مولاناؒ کے رشحات قلم، اذکار و حوادث اور بیانات و خطابات مرقومہ کے وثائق مرتب ہو جائیں گے تو ہم موازنہ کر سکیں گے کہ کسی شخص نے ہماری حیات سیاسیہ کی حوصلہ مندیوں

کی راہیں متعین کیں، اور کونسا لائحہ عمل ہمیں آیندہ اخذ کرنا چاہیئے۔ باتیں تو کہنے کی بہت ہیں مگر ایک نشست میں کہنا ممکن بھی نہیں۔

مولاناؒ کی روح ابھی ہم سے خود مائل گفتار ہے اور اس کی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے، اس کو نہاں خانۂ دل میں جاگزیں کیجئے۔ "وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا يَعْلَمُونَ ط" ورنہ اگر داستان سرائی ہی مقصود ہو تو ہمیں کہنا پڑیگا کہ ؎

دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید نیست"

ما ہمچناں در اوّلِ وصف تو ماندیم

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی ہے اور عالم تصور اس تصویر کو حقیقت بنا کر پیش کر رہا ہے جو کبھی مشاہدۂ عام و خاص میں تھی۔ رات کی تنہائی ہوتی اور حضرت مولاناؒ کے جہادِ حریت کی داستان ایک نئی نگاہ مضطربانہ اس بطلِ حریت کے عزائم و حصولِ مقاصد کی جھلک کو دیکھکر لرزاں لرزاں قلب نحیف میں ایمان کی روشنی پاتا اور چشم و گوش سے حاصل کئے ہوئے خزانوں کو بے چینی کے ساتھ محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا، لے وائے نصیب کہ وہ متاعِ گرانمایہ بھی اب گم ہو چکی اور جو کچھ باقی ہے وہ صرف ایک نقش مضطرب! اے کاش کہ یہی تسامل حال ہے ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ابوالمحاسن محمد سجادؒ

(از جناب راغب احسن صاحب ایم اے جنرل سکریٹری کلکتہ ضلع مسلم لیگ)

[اس مجموعہ کے مضمونوں میں یہ مضمون خاص امتیاز کا مالک ہے۔ اس کے لکھنے والے جناب راغب احسن صاحب، اپنے سیاسی علم، خلوص اور استقلال وانہماک کے لحاظ سے پورے ملک میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں انہوں نے مولانا محمد سجادؒ کے کارناموں پر ایک "مسلم لیگی" کے نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے، اور اس مجموعہ کی افادیت کے لئے یہ اچھا ہوا کہ اس طرح پر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کا نقطۂ نگاہ سامنے آگیا۔

فاضل مضمون نگار کو مسئلہ امارت کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ "اُن کے خیال میں امارت کی تاسیس محکومیت پر قناعت اور محکومیت کو آئینی صورت اور شکل دیدینے کے مرادف ہے، اور مولاناؒ نے گویا ایک کافر اسٹیٹ کے تولادی خول کے اندر امارت شرعیہ کی ایک محکومانہ پوزیشن طلب کی تھی" الخ الخ

مضمون نگار کا یہ خیال صحیح نہیں، تاسیس امارت شرعیہ ایک مرض کا عارضی علاج ہے، سوال یہ ہے کہ جب کسی ملک پر کافروں کا استیلا ہوجائے تو محکوم مسلمان کیا کریں؟ شرعی احکام کے نفاذ کے لئے کونسا طریقہ اختیار کیا جائے؟ ایک پرجوش مسلمان جواب دیگا "اسلامی حکومت کے

قیام کی جد و جہد کی جائے"۔ صحیح اور درست!! لیکن اگر فوری طور پر کامیابی نہ ہو اور ملک 'دار الحرب' کی جگہ دار الکفر ہو' تو پھر کیا کیا جائے؟ اسلامی زندگی بسر کرنے اور معمولی شرعی قوانین کے اجراء و نفاذ کے لئے کوئی نہ کوئی نظام تو قائم کرنا ہی پڑیگا۔ امارت شرعیہ' اسی اسلامی نظام کا دوسرا نام ہے[1]' یہ ہندوستان کے ایک صوبہ میں 'امارت' کے نام سے قائم ہوئی، فلسطین میں 'مسلم سپریم کونسل' (المجلس الاسلامی الاعلیٰ) اسی قسم کی دوسری شکل تھی' چند صدی پہلے صقلیہ میں' اور آج کل یوگوسلاویہ میں' اس قسم کے اسلامی نظام کے اداروں کا کامیاب تجربہ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔

لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مولانا سجاد مرحوم یا دوسرے داعیانِ امارت کا یہ آخری 'نصب العین' ہے' حاشا وکلا!! اس مخلص مجاہد کے دامن پر اس سے زیادہ بدنما دھبہ اور کوئی نہیں لگایا جا سکتا۔ مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ بھی 'اسلامی حکومت کی تاسیس' کے داعی تھے' اور یہی ان کا نصب العین تھا' مسلم نیشنلزم' اور کمال اتاترک جیسی 'اسلامی حکومت' نہیں' بلکہ وہ خالص 'الٰہی حکومت' (منہاج خلافت راشدہ پر) کے قیام کے داعی تھے۔

بھائی راغب صاحب سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہو سکتا ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک ڈپلومیٹ

---

[1] مسئلۂ امارت کی شرعی حیثیت اور قرآن و حدیث کے نصوص کے لئے' مولانا عبد الصمد رحمانی کی نئی کتاب 'ہندوستان و امارت' سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جس کا مسودہ مولانا مرحوم کی نظر سے گذر چکا تھا۔ م' غ'

تھے اور وہ بساطِ سیاست پر اپنے تمام مہرے نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ وہ نصب العین اور مطالبہ میں فرق کرتے تھے، امارتِ شرعیہ اور نظارتِ امورِ شرعیہ کو فوری پروگرام اور مطالبہ کی حیثیت حاصل تھی اور اسلامی حکومت کی تاسیس ان کا وہ نصب العین تھا، جس سے وہ کبھی غافل نہیں ہوئے۔

یہ اس مضمون کی مرکزی بحث تھی، جس پر تھوڑی سی تفصیل ناگزیر تھی۔ اب بعض باتوں کی طرف سرسری اشارہ کرکے، اس 'جملہ معترضہ' کو ختم کرتا ہوں۔

(۱) امارتِ شرعیہ کا نظام خالص اسلامی ہے، وہاں نہ انگلستان کی دستوریت ہے، نہ امریکہ کی جمہوریت، اور نہ جرمنی اور اٹلی کی آمریت؛ ہم اس نظام کو نظامِ خلافتِ راشدہ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

(۲) نیشن اسٹیٹ، مولانا کا نصب العین نہیں تھا، البتہ سر دست صرف حکومت کے خلاف معرکہ آرائیوں میں وہ نیشنل کانگریس کی ہمنوائی کرتے تھے، اور نہ وہ کانگریس کی غیر مشروط شرکت کے حامی تھے، کانگریس کی مشروط اور مجموعی شرکت کے متعلق انہوں نے ایک خاص تجویز مرتب کی تھی، جس کا ذکر مولانا محمد منظور نعمانی کے مقالہ میں کیا گیا ہے۔

(۳) مسلم نیشنلزم اور پاکستان کی تعمیر اور ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی تعمیر مقالہ نگار کے نزدیک مترادف ہیں، افسوس کہ ہم ایسا نہیں سمجھتے، مسلم نیشنلزم تو ایران اور ترکی میں بھی موجود ہیں، لیکن اسلام کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسلام اور مسلم کے فرق کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ایران، ترکی، افغانستان، مصر، عراق سب کی سب اسلامی نہیں، بلکہ مسلم حکومتیں ہیں۔ البتہ اتنے فرق کے ساتھ کہ ترکی اور ایران کے ارباب بست و کشاد

کو 'اسلام' اور 'اسلامی' چیزوں سے نفرت ہے 'عراق پر "عربیت" غالب ہے، افغانستان اور مصر میں الحمدللہ کہ ابھی اسلام کی بو باس باقی ہے۔ حجاز و نجد اور یمن کی سلطنتیں اسلامی نظام سے قریب تر ہیں۔

(۴) 'متحدہ قومیت' کے جو معنی عام طور پر لیے جاتے ہیں، اس کے قبول کر لینے کے بعد، راقم کے خیال میں کوئی شخص 'اسلام' پر قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ مولانا مرحوم کا نقطہ نگاہ ایک پکے مسلمان کا نقطہ نگاہ تھا، ہم انہی کے اصلی الفاظ نقل کیے دیتے ہیں:-

"..... اور اُن خصوصیات کو قطع نظر کر کے مغربی سیاسیین کے نظریہ کی اتباع
"کرتے ہوئے اس براعظم میں اس قسم کی قومیت متحدہ کی تخلیق کی سعی کرنا جو یورپ
"کے کسی ملک میں ہے، محض بے سود ہی نہیں بلکہ ملک کے لیے تباہ کن بھی ہے کیونکہ
"اس ملک کی دو بڑی جماعتیں مسلمان اور ہندو بحیثیت مجموعے دو علیٰحدہ علیٰحدہ ممتاز
"قومیت رکھتی ہیں .... مغربی تخیل کے مطابق ہندوستان میں
متحدہ قومیت کا قیام ناممکن ہے۔"

(خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ بہار پراونشل مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی)

(۵) اگر واقعتاً کسی طبقے میں "ملائیت" (اسی کلائیت) کا وجود ہو تو کم از کم راقم بھی اس کی مذمت میں راغب صاحب کا ہم نوا ہے، 'اسلام' میں نہ کلائیت ہے اور نہ مولویوں کا کوئی موروثی طبقہ ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ نئے لکھے پڑھوں نے عربی زبان اور دینی تعلیم سے یکسر بے اعتنائی برتی اور

اور دینی علوم سے واقفیت رکھنے والے، خواہ مخواہ "علمار" کے نام سے موسوم ہو گئے۔ یہ ملک وملت کی بدبختی ہے کہ دین اور دینی علوم سے بے اعتنائی بڑھتی جارہی ہے، اس کا معمولی نمونہ کاظمی صاحب کا "خلع بل" ہے۔ مکار ملّا اور مذہبی واقفیت کے جھوٹے مدعی (اور مجتہد) دونوں ملت کے لئے لعنت ہیں۔

(۶) بعض باتیں خلاف واقعہ بھی اس مضمون میں درج ہو گئی ہیں، جیسے :-

(الف) مولاناؒ کی بریلویت، مولاناؒ نہ بریلوی تھے، نہ دیوبندی، انہیں حنفیت میں بھی غلو نہیں تھا، ان کے مسلک کے متعلق صحیح بیان مولانا محمد اصغر حسین صاحب بہاری کے مضمون میں ملے گا۔

(ب) انوار العلوم کے جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ یکسر غلط ہے۔ غالباً مضمون نگار تک صحیح روایت نہیں پہنچی۔

(ج) احرار پارٹی اور یونائیٹڈ پارٹی کے باہمی اختلاف کو مولانا کے سر تھوپنا صحیح نہیں۔ انڈیپنڈنٹ پارٹی کے وجود سے پہلے ہی یہ دونوں پارٹیاں باہم دست وگریباں تھیں۔

(د) "امیر شریعت" کا انتخاب علمار کے بھرے مجمع میں کیا گیا تھا، تفصیل مولانا عبد الصمد رحمانی کے مضمون (قیام امارت شرعیہ) میں ملے گی۔

(ہ) یہ بھی صحیح نہیں کہ "دار القضار، بیت المال، نظام نقبا، ناظمین وغیرہ وغیرہ کا آج کہیں وجود نہیں۔ امارت شرعیہ کے تمام شعبے بدستور اپنی اپنی جگہ پر کام کررہے ہیں۔

(۹) امارت شرعیہ کے متعلق فاضل مضمون نگار کی غلط فہمی، تو اس نوٹ کے آغاز ہی میں واضح کردی گئی ہے۔ اب ان کا تضاد بیان ملاحظہ ہو۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"مولانا سجادؒ نے امارت شرعیہ کی تاسیس میں اپنی قیادت فکری وعملی کے تمام جوہر دکھائے، اور اگر وہ اس امارت کو خالص شرعی معاملات کی تنظیم تک محدود رکھتے اور اس کو ملت اسلامیہ ہند کی عام سیاست سے منقطع نہیں کرتے، ..... تو یقیناً ان کی تاسیس ان کے بعد بھی ایک مفید ملت انجمن کی حیثیت سے زندہ رہتی اور مسلمانوں کی آزادی کامل کے جہاد میں ان کی معاون ہوتی"

مطلب یہ ہے کہ اگر امارت شرعیہ مسلمانوں کی رائے عامہ یا مسلم لیگ یا مسلم کانفرنس کے ساتھ چلتی تو مفید ملت انجمن ہوتی۔

اس کے برعکس دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

"امارت شرعیہ کا تصور فی نفسہ غلط، غیر اسلامی اور خطرناک تھا، ایک بے طاقت امارت شرعی کا تصور اساساً، اصلاً اور جوہراً غلط بے بنیاد اور انتہائی گمراہ کن تصور ہے"

آخر یہ کیا بات ہے، ایک چیز جو سرے سے "غلط" اور "گمراہ کن" ہے، مفید ملت کس طرح ہوسکتی ہے؟

باتیں کہنے کی بہت ہیں، راقم نے صرف اصولی باتوں کو لیا ہے: اب ہم ناظرین اور فاضل مضمون نگار کے درمیان زیادہ دیر تک حائل نہیں رہنا چاہتے۔ (م ع)

حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت صوبہ بہار سکریٹری جمعیۃ علمائے ہند کے انتقال پرملال کی اچانک خبر سے مجھے جو دلی صدمہ اور افسوس ہوا اس کا اظہار میں اخبار عصر جدید کلکتہ میں اپنے تعزیتی نوٹ میں کر چکا ہوں۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ سیاسی شعور کو پہنچنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو اکثر سیاسی میدان میں مولاناؒ کے خلاف ہی پایا۔ اور پوری قوت اور کامل دیانت کے ساتھ ان کی بعض ہنگامی پالیسیوں کی مخالفت کی۔ تاہم مجھے اقرار ہے کہ مولانا سجاد صاحبؒ کی قابلیت وصلاحیت، سیاست کاری وسیاست دانی اور مسلمانوں کی تنظیم وتقویت کے لئے حقیقی تڑپ کا برابر معترف رہا۔

گاؤں کی مسجد کا واقعہ

سب سے اول مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے نام سے میں اپنے بچپن میں اپنے دیہات واقع ضلع گیا میں ایک مسجد میں واقف ہوا۔ جہاں تک مجھ کو یاد ہے یہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ مولانا نے حسب معمول اپنے مدرسہ انوار العلوم گیا کے متعلق کوئی اعلان شائع کیا تھا، اور یہ اشتہار ایک گاؤں کی خوبصورت مسجد کے ممبر پر چسپاں کیا گیا تھا۔ اس کا پورا مضمون تو مجھ کو یاد نہیں ہے۔ لیکن اتنا اچھی طرح یاد ہے کہ اس اعلان کا اصل الاصول یہ تھا کہ مسلمانان ہند کی تمام خرابیوں اور کمزوریوں کا علاج یہ ہے کہ وہ دینی اور دینی علوم کی اشاعت کریں اور اپنی کھوئی ہوئی مرکزیت کو قائم کریں، سارے

مضمون میں مسلمانوں کی مرکزیت پر زور دیا گیا تھا اور فقدانِ مرکزیت کو مسلمانوں کی اجتماعی خرابیوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا تھا۔ مرکزیت کے لفظ کو اشتہار میں جلی حروف میں لکھا گیا تھا۔

یاد ہو دیکہ اس وقت میں ایک بچہ تھا جس نے شہر کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی، اُردو کی پہلی دوسری کے سوا کچھ نہ جانتا تھا، اور دُنیا کے مسائل سے بالکل بے خبر تھا، لیکن اس اعلان خفی کا اثر جو آج بھی اپنے دل و دماغ میں محسوس کرتا ہوں، اور عصر کی نماز کے بعد گاؤں کی خوبصورت فراخ اور عالی شان مسجد کے روشن صحن میں میں نے جو کچھ پڑھا اور سمجھا تھا آج تک میرے صفحۂ باطن پر نقش کالحجر کی طرح محفوظ و مرتسم ہے۔

گیا کانگریس اور جمعیۃ علماء

حضرت مولانا محمد سجادؒ کو پہلی دفعہ (اور یہ آخری دفعہ بھی تھا اسلئے کہ پھر مولاناؒ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا) میں نے گیا کانگریس ۱۹۲۲ء کے موقع پر جمعیۃ علمائے ہند کے عظیم الشان پنڈال میں دیکھا تھا۔ گیا کانگریس کا اجلاس زیر صدارت مسٹر سی۔ آر۔ داس آنجہانی ہو رہا تھا۔ سوراج پارٹی کی بنیاد پنڈت موتی لال نہرو، داس اور حکیم اجمل خاں مرحوم ڈال رہے تھے۔ گیا میں اس موقع پر آل انڈیا خلافت کانفرنس اور جمعیۃ علمائے ہند کی سالانہ کانفرنسیں بھی ہو رہی تھیں۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا، کانگریس، خلافت اور جمعیۃ کے پنڈال دریائے پھلگو کے کنارے شہر سے باہر ریت کے ٹیلوں اور خوبصورت پہاڑیوں کے دامن میں قائم تھے۔

کانگریس اُس وقت بھی سرمایہ داروں کی مجلس تھی اس کا پنڈال ہندو طرز تعمیر کا نمونہ تھا

صدر گیٹ، دروازے، اور اس کے ستون، بدھسٹ طرز تعمیر کے مطابق بنائے گئے تھے، اس کا ظاہر و باطن کاملاً ہندو تھا، اس کی تعمیر پر ہزاروں ہزار روپیہ خرچ کیا گیا تھا۔

اس کے بالکل برعکس جمعیۃ علمائے ہند کا پنڈال، اسلامی سادگی، نفاست اور جدت، اور 'انڈو سارا سینک' (INDO-SARACENIC) عربی ہندی طرز تعمیر کی رعنائیوں کا آئینہ دار تھا۔ اس کے عالی شان صدر پھاٹک اور داخل و خارج ہونے کے دروازوں پر عربی حروف میں، معنی خیز آیات قرآنی درج تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہزاروں لاکھوں ہندو روزانہ جمعیۃ علماء کے پنڈال کو آکر دیکھتے اور تعریف کرتے تھے۔ جو کلمہ سب کی زبانوں پر عام تھا وہ یہ تھا کہ باوجود سادہ اور کم خرچ ہونیکے جمعیۃ کا پنڈال، کانگریس کے پنڈال سے ہزار درجہ زیادہ آرام دہ، زیادہ روشن و فراخ اور زیادہ حسین و جمیل اور زیادہ عالی شان، زیادہ پرشکوہ تھا۔ اور یہ سب کچھ مولانا سجاد کی اعلیٰ تعمیری صلاحیت کا نتیجہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ مولانا نے یہ سارا انتظام انتہائی بے سروسامانی، بے مائگی اور پریشانی کے عالم میں اور قلیل ترین وقت یعنی صرف چند دنوں کے اندر کیا تھا۔ گیا کی جمعیۃ علماء کانفرنس، اور خلافت کانفرنس کی اصل روح رواں، دماغ مدبر اور مرکزی شخصیت مولانا سجاد کی ذات تھی۔ مولانا سجاد نے محض چند گنے ہوئے دنوں کے اندر جمعیۃ علماء اور خلافت کانفرنس کے متعلق جملہ انتظامات باوجود غربت، افلاس اور بے سروسامانی کے اتنے اعلیٰ پیمانہ اور ہنر مندی بلکہ نادر زین انداز پر کیا تھا کہ ہندو مسلم اکابر کی نگاہیں بے اختیار مولانا پر مرکوز ہو رہی تھیں، اور سب کی زبانیں اس حقیقت کے اعتراف میں ہم آواز تھیں کہ گیا کانگریس نے ملک کی ایک نادر اور حیرت انگیز تنظیمی قوت

کا انکشاف کیا ہے۔ مولانا حکیم ابو البرکات عبد الرؤف صاحب قادری دانا پوری جمعیۃ علماء ہند کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے۔ آپ نے مولانا سجاد کی انتظامی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے کھلے اجلاس میں فرمایا تھا کہ

"مولانا سجاد نے مسلمانوں کی عظیم الشان تنظیمی اور سیاسی کاردانی کا جو ثبوت دیا ہے، وہ اس درجہ بلند ہے کہ موقع ملنے کے بعد مولانا کو ہندوستان کا گورنر اور گورنر جنرل بنانا موزوں ہوگا کیونکہ وہ ایک نئے ہندوستان کے نئے خیالات و اصول کے مطابق تعمیر کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔"

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دار العلوم دیوبند، صدر اجلاس نے جو خود بھی بہت بڑے منتظم بزرگ تھے اس خراج تحسین کی تائید فرمائی تھی۔

اسی اجلاس گیا کے موقع پر مجھے مولانا مرحوم کی تقریر سننے کا پہلا موقع ملا تھا اور یہ محسوس ہوا تھا کہ وہ صاحب بیان نہیں، بلکہ صاحب عمل بزرگ تھے۔

"منتظم، معمار، خلاق اور آرٹسٹ"

مولانا سجاد نہ صرف ایک بڑی تنظیمی صلاحیت رکھنے والے بزرگ تھے بلکہ جدید (ORIBINAL) خیالات و افکار رکھنے ایک معمار، خلاق بھی تھے وہ صرف منتظم اور مدبر ہی نہیں تھے بلکہ مفکر، مجتہد اور آرٹسٹ بھی تھے اور کوئی اول درجہ کا معمار اور آرٹسٹ ہو ہی نہیں سکتا ہے جب تک وہ اعلیٰ درجے کی قوت تخیل اور اعلیٰ درجے کی قوت تخلیق نہ رکھتا ہو۔ اور گیا کے ملی مجالس اور اس کے متعلقہ انتظامات اُن کی اعلےٰ قوت تخیل اور اعلےٰ تخلیق کے مخلوقات فکر و عمل تھے۔ مولانا کی شخصیت میں بیک وقت

اعلیٰ درجے کی انتظامی صلاحیت اور عملی طاقت کے ساتھ نئے نئے خیالات و تعمیرات کے عدم سے وجود میں لانے کی تخلیقی قوت بھی جمع تھی، وہ نہ صرف حسب موقع نئے خیالات کو قبول کر سکتے تھے، بلکہ نئے خیالات کی آفرینش کی بھی قوت رکھتے تھے، اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اپنے نئے خیالات کے مطابق ایک نئی دنیا کی تعمیر بھی کر سکتے تھے۔

اجلاس گیا کے موقع پر ہر چیز اور ہر انتظام پر مولانا سجاد کی تخلیقی شخصیت اور اجتہادی آرٹ کا چھاپ صاف نمایاں تھا۔

ایک سانحۂ لطیف اور انقلابی لاٹ پادری کا پارٹ

مولانا محمد سجاد کی شخصی زندگی میں، تحریک خلافت نے زبردست انقلاب پیدا کیا، مسلمانوں میں معاشرتی اصلاح کے زبردست حامی ہونے کا ثبوت وہ پہلے ہی اپنے ایک ایسے اقدام سے دے چکے تھے جس نے گیا کی مسلم سوشیل سیاست میں بھونچال ڈال دیا تھا اور مولانا کی سیاست کاری، ڈپلومیسی اور کاردانی کا لوہا مخالفین سے بھی منوا لیا تھا۔ اگرچہ گیا کی مسلم سوسائٹی میں اس ڈرامائیک سانحۂ لطیف اور حادثۂ عظیم کے متعلق، جو ممتاز خاندان کے لئے کامیڈی اور دوسرے ممتاز خاندان کے لئے ٹریجڈی ثابت ہوا تھا جس میں مولانا نے ایک انقلابی لاٹ پادری کا پارٹ ادا کیا تھا ہمیشہ دو رائیں رہیں گی لیکن اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ رسوم زمانہ کے خلاف لیکن سنت نبوی کی رہبری میں رئیس اعظم گیا کی بہو کو ایک دوسرے صوبے کے مسلمان کے ساتھ عقد ثانی پر آمادہ کرکے اور تمام مخالفتوں کے

باوجود اپنی حمایت عملی سے اس کو انجام دلا کر، مولانا نے اپنی بے نظیر سیاست کاری اور اقدامی صلاحیت کا ثبوت دیا تھا۔

"فرقہ پرست" سے "پان اسلامسٹ"

بعض حلقوں میں بیان کیا گیا ہے کہ مولانا سجاد دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور دیوبندی تھے۔ لیکن اس بیان میں صداقت سے زیادہ موجودہ سیاسی فرقہ دارانہ پروپگنڈا کی رنگ آمیزی ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا سجاد تحریک خلافت سے پہلے اُن غالی حنفیوں یا بریلویوں میں شمار ہوتے تھے، جو بدعتی کہلاتے ہیں اور جو اپنے جوش غلو میں کفر کی صداؤں کو تو چُپ چاپ سُن لیتے ہیں۔ لیکن آمین بالجہر کی آواز کو برداشت نہیں کرسکتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مولانا سجاد نے عام دستور زمانہ کے مطابق سخت حکم دے رکھا تھا کہ کوئی طالب علم جو رفع یدین کرتا ہو یا آمین بالجہر کہتا ہو، ان کے مدرسہ انوار العلوم میں داخل ہوکر تعلیم نہیں پاسکتا تھا۔ ایسے واقعات بھی مجھ کو معلوم ہیں کہ بعض طلبہ کو صرف اس لئے مولانا نے مدرسہ سے خارج کردیا تھا کہ ان پر رفع یدین کرنے یا اہل حدیث علماء سے درس لینے کا الزام تھا، یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جبکہ مسلمانوں کا مشغلہ مذہبی مناظرات اور مجادلات کے سوا کچھ نہ تھا۔ بڑوں اور چھوٹوں کی ساری طاقتیں اسی میں صرف ہو رہی تھیں۔

لیکن یہ مولانا کی عظمت کا اصلی ثبوت ہے کہ جب ان کو اس عدم رواداری اور غلو کی غلطی معلوم ہوگئی، اور جنگ عظیم کے بعد دنیائے اسلام کی عام بربادی کی مصیبت عظمیٰ نازل ہوئی

اور عام اتحاد اسلامی کی سخت ترین ضرورت کا احساس ہوا، اور تحریک خلافت نے ملک و ملت کا نقشہ منقلب کر دیا تو مولانا سجاد کے ترقی پذیر، فطین و ذہین دماغ نے فوراً اصلاح قبول کر لیا۔ وہ ایک پکے پان اسلامیسٹ ہو گئے اور قومیات کے میدان میں آکر ایسے بدل گئے کہ ان کا پہچاننا مشکل ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایسے لوگوں کے لئے جو مولانا کے ابتدائی حالات اور ان کی سیرت کے ارتقائی منازل سے بے خبر ہیں، ان کے لئے میرا یہ بیان ایک تعجب انگیز انکشاف ہوگا جس پر اُن کے بعض معتقدوں کو شاید شبہ بھی ہو۔ لیکن اس حقیقت کے بیان سے در اصل مولانا کی شخصیت کی حقیقی طاقت اور صلاحیت ذاتی کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا کی شخصیت نہ صرف اپنے جسم کے لحاظ سے بلکہ اپنے باطن کے اعتبار سے ایک ترقی پذیر زندہ نامیہ تھی۔ مولانا پتھر نہیں تھے بلکہ انسان تھے، اور انسان وہی ہے جو خود بھی بدل سکتا ہو اور دنیا کو بھی بدل ڈالنے کی قوت رکھتا ہو۔ اور مولانا میں یہ دونوں قوتیں موجود تھیں۔

مولانا عالی مولویوں کے ایک ایسے طبقۂ خاص میں پیدا ہوئے پروان چڑھے اور نمایاں ہوئے جو عموماً اپنے جمود و خمود اور تقلید جامد کے لئے خود علماء میں نمایاں امتیاز رکھتا ہے، لیکن یہ اُن کی فطرت مسلمہ اور صلاحیت ذاتی کا ثبوت ہے کہ وہ اس طبقہ کی سطح سے نہ صرف خود بلند و بالا ہو گئے بلکہ بہتوں کو بلند و بالا کر دیا اور جماعت علمائے اسلام کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔

مولانا مرحوم کی خصوصیات

مولانا سجاد جدید اسلامی ہند کے صفِ اول کے رجال دین و سیاست میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، وہ ان چند واقعی لائق

ترین سیاسیین میں تھے، جن کو تحریک خلافت نے پردہ گمنامی سے ابھار کر ہندوستانی سیاست کے صف اول میں کھڑا کیا تھا۔ پھر وہ تحریک خلافت کے رہنماؤں میں اپنی اصابت رائے، سیاست دانی، معاملہ فہمی، نکتہ رسی، ذہانت، عملی صلاحیت، تنظیمی طاقت، کاردانی، کاربرداری، عزم و استقلال کے ساتھ ایک نصب العین کے لیے مسلسل یکسوئی سے محنت کرنے کی قابلیت، حالات وضروریات کے مطابق زمانہ کے ساتھ چلنے اور ساتھ دینے کی اہلیت اور اپنے مقاصد کے لیے معیار اصول سے فروتر لوگوں اور چیزوں سے مصالحت کر لینے کی قوت کے لیے ممتاز تھے۔

مولانا سجاد علمائے ہند میں نہ صرف سب سے زیادہ سیاسیات حاضرہ کے ماہر تھے، بلکہ سب سے بڑے عملی سیاست کار بھی تھے، سیاسیات مغرب کے متعلق نہ صرف ان کا علم دوسرے مولویوں سے زیادہ بہتر تھا بلکہ وہ اُن سے زیادہ (موجودہ سیاسی) ادارات سے کام لینے کی قابلیت رکھتے تھے، اور غالباً مسلمانان ہندوستان میں اُن سے بڑھکر کوئی دوسرا تنظیمی صلاحیت کا انسان نہیں تھا۔ افسوس اس کا ہے کہ اُن کی تنظیمی صلاحیت ایک محدود دائرہ میں بند ہو کر ختم ہو گئی، اگر وہ قوم کا ساتھ دیتے اور قوم ان کا ساتھ دیتی تو جیسا کہ مولانا دانا پوری نے فرمایا تھا کہ وہ ایک نئے ہندوستان اور کم از کم ایک جدید اسلامی ہندوستان کی تعمیر میں ایک اول درجہ کے معمار کا پارٹ ضرور ادا کرتے۔

مولانا سجاد ہندوستان کے تمام علماء میں سب سے زیادہ عملی سیاست اور دنیاوی معاملات کو سمجھنے اور اُن کے برتنے والے کاردان مدبر تھے، وہ انگریزی نہیں جانتے تھے، لیکن انگریزی سیاست

و دستور اور مغربی تمدن و قانون کو خوب سمجھتے تھے اور ان کی ماہرانہ سیاست دانی اور سیاست کاری کا یہ بہترین اور ناقابل تردید ثبوت ہے کہ انہوں نے بہت سے انگریزی داں سیاست دانوں کو شکست دیدی تھی۔ کیوں اور کس طرح؟ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ مولانا مغربی سیاست اور حکمت عملی کو برتنا توڑنا اور جوڑنا جانتے تھے، اور انہوں نے بلا جھجھک اُس کے طریقوں کا استعمال کیا تھا۔ بہار اسمبلی کے اولین جنرل الیکشن میں مولانا سجاد نے مولانا شفیع داؤدی صاحب لیڈر احرار پارٹی جیسے محب قوم اور عزیز ملت سید عبدالعزیز لیڈر مسلم یونائیٹڈ پارٹی جیسے لائق قانون داں اور وزیر حکومت کی پارٹیوں کو عملاً شکست دیکر بہار اسمبلی کی اکثر مسلم سیٹوں پر امارت شرعیہ کی قائم کردہ مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ذریعہ قبضہ کیا، انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ہر ممبر سے امارت شرعیہ کی تابعداری کی بیعت لیا، ایک خالص دنیا دار بینکر اور مصلحت بیں، زمانہ ساز سرمایہ دار بیرسٹر کو پارٹی کا لیڈر مقرر کرایا۔ اور کانگریس سے کولیشن کرنے کی امید میں انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ممبران اسمبلی کے اولین جلسہ میں امیر شریعت کی اطاعت اور کانگریس اور کانگریسی پروگرام کی تائید کا اعلان کرایا۔ لیکن جب بعض وجوہ سے کانگریس نے آفس قبول کرنے اور وزارت بنانے سے انکار کردیا، تو بلا جھجھک چند ہی دنوں کے بعد مولانا سجاد نے اپنی انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لیڈر کو خود وزارت بنانے کی اجازت دیدی۔ بظاہر یہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کے اعلان کردہ بیانات اور اصول کے خلاف تھا، لیکن مولانا سجاد کی زندگی میں اکثر عملی سیاست میں طاقت پر قبضہ کرنا اور مصلحت وقت کا ساتھ دینا اصول سے برتر رہا ہے۔ مولانا سجاد کے ساتھ انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت بہار کے

زمانے میں پہلی بار مجھ سے خط و کتابت ہوئی تھی۔ مولانا نے اپنے خط میں اس کا اقرار کیا تھا کہ وزارت کا بنانا، کانگریس کی حمایت کے اعلان اور پیلیج کے بعد بظاہر اصول کے خلاف تھا لیکن مصالح قومی اور ضرورت وقتی کے لئے اکثر اصول کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے۔ مولانا نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ وہ اسلامی شریعت کے تحفظ کے لئے بعض مسودات قانون کی فکر میں تھے، شریعت اسلامیہ کے تحفظ و استقلال کی فکر در اصل ان کی فکر زندگی تھی۔

امارت انڈیپنڈنٹ مسلم پارٹی اور مغربی سیاست کا دلدل

واقعہ یہ ہے کہ مولانا سجاد نے اپنی سیاسی زندگی، مغربی سیاست کی مخالفت اور اسلامی سیاست و امارت کی تبلیغ کے ساتھ شروع کی تھی، لیکن افرنگی سیاست کے خلاف اس زندگی بھر کی جنگ کا ایک نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ نہ صرف مغربی سیاست اور ڈپلو ماسی کے ماہر ہو گئے تھے بلکہ مخالفین کے خلاف اکثر مغربی سیاست اور ڈپلومیسی کے طریقوں کو استعمال بھی کرتے تھے۔ اور بعض اوقات بڑے بڑے انگریزی داں سیاسیین اور مقننین کو بھی اس کھیل میں مات کر دیتے۔ بنا بریں مولانا سجاد غالباً علمائے ہند میں واحد شخص تھے جو ایک یوروپین ڈپلوماٹ کا تدبر، ایک ہندوستانی زمیندار کے کارپرداز کی ماہرانہ کارپردازی، اور ایک عاشق صادق کی عقیدت و عزم راسخ اور ایک سالک راہ سلوک کی کمال یکسوئی اور استقلال کے اوصاف اپنی سیرت میں جمع رکھتے تھے۔

مولانا مرحوم جب بات کا عزم کر لیتے تھے اور جو بات ان کے ذہن میں جم جاتی تھی، خواہ وہ صحیح

ہو یا غلط، اس کے لئے اپنے غیر معمولی دماغ اور جسم کی ساری قوتوں کے ساتھ وقف ہو جاتے تھے۔ اور جی جان سے اس کے پیچھے پڑ جاتے تھے اور ہر طریقہ سے اس کو کامیاب کرنے کے لئے ہر ممکن سے ممکن تدبیر سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے مخالفین کے کیمپ میں پھوٹ ڈالنے اور ان کی قوتوں کو پاش پاش کر دینے کی ہر ممکن صورت اختیار کرتے تھے۔

مولانا کبھی شکست قبول نہیں کرتے تھے، اور کبھی شکست کو معاف بھی نہیں کرتے تھے، وہ کبھی نہ تھکنے والے کارکن تھے اور باوجود لیڈر ہونے کے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے معمولی سے معمولی اور حقیر سے حقیر کام کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے، وہ ایک بڑے کام کا نقشہ بہت سنجیدگی اور غور و فکر کے بعد بناتے تھے اور اس کو عمل میں لانے کے لئے بہت دور سے آتے تھے اور بہت طویل اور وسیع تیاری کے ساتھ تدبیریں کرتے تھے، وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے تھے، اور خواہ حالات کتنے ہی ناموافق کیوں نہ ہوں اور سامان اور معاون کتنے ہی کم کیوں نہ ہوں، اور ان کو کتنی ہی ہار کیوں نہ ہوتی ہو، وہ بڑے بڑے کام کا عزم کرتے اس کے لئے نقشہ بناتے اور اس کو پورا کرنے کے لئے ہر چیز کی بازی لگا دیتے تھے۔

مولانا بلا کے اڑنے والے مستقل مزاج، ثابت قدم، جنگجو سپاہی تھے، وہ دشمن کو زیر کرنے کے لئے کسی تدبیر، کسی طریقہ اور کسی ذریعہ کو ترک نہیں کرتے تھے، مولانا کا عقیدہ تھا اور انہوں نے اپنے اس عقیدہ کو میرے دوست جناب قاضی محمد عثمان صاحب ایم، اے، بی، ایل ہیڈ ماسٹر ریذیڈنسی مسلم ہائی اسکول پر خود ظاہر فرما دیا تھا کہ ایک بڑے اور نیک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر طریقہ

کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اُن کا دماغ لامحدود تدابیر کا محدود خزانہ اور حکمت عملیوں کا کارخانہ تھا۔ یہی باعث تھا کہ مولانا مغربی پروپگنڈا کے فن میں اپنے بہت سے حریفوں سے زیادہ ماہر ثابت ہوئے تھے۔

مولانا سجاد کی عملی سیاست دانی اور سیاست کاری کا بیان ناقص ہوگا اگر قوم کی عبرت کے لیے ان کی الیکشن گردی کے واقعات پر روشنی نہ ڈالی جائے۔

مولانا سجاد ہندوستان کے طبقہ علماء میں واحد شخص تھے جس نے ملکی دستور و قانون، مجالس آئین ساز، نیابتی اور انتخابی ادارات اور جمہوریت مغرب کے مسائل کا عملی مطالعہ کیا تھا، اور جنہوں نے ان کو اپنے آئیڈیل اور مقصد اعلیٰ کو حاصل کرنے کے لیے بطور آلہ کار استعمال کرنے کی کوشش کی۔ مولانا سجاد اسلامی سیاسیات، اسلام کے اصول شریعت و اصول قانون و دستور، اسلام کے اصول سلطنت و عدالت، اسلام کے اصول تعلقات بین الاقوامی اور اسلام کے نظام اقتصادیات و معاشیات کو تمام مغربی و مشرقی نظاموں سے بہتر اور بالاتر مانتے تھے۔ اور اپنے بیانات و تحریرات میں یہ واضح کر چکے تھے کہ وہ ان کو اپنا آئیڈیل یقین کرتے تھے، اور ساری دنیا کے لیے اُن کو رہنما مانتے تھے، وہ انگریز کے عطا کردہ اصلاحات اور مجالس آئین ساز کو ناقص قرار دیتے تھے۔

لیکن مولانا صرف خیالی مُفکّر اور آئیڈیلسٹ نہیں تھے، وہ اپنے نصب العین اور آئیڈیل کو عملاً حاصل کرنے کے لیے موجودہ حقیقت (REALITY) کے ساتھ مصالحت کرنا جائز رکھتے تھے، بنا برین

ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا نے مجالس آئین ساز اور گورنمنٹ اور پاور پر قبضہ کرنے کے لئے انڈیپنڈنٹ پارٹی کی تشکیل کی اور اس کا اصل الاصول امارت شرعیہ کی مذہبی "ہولی سینوڈ" -HOLY (SYNDU) کی تابعداری قرار دیا۔ یعنی پارٹی کے ہر ممبر کے لئے امیر شریعت کی بیعت ضروری قرار پائی اور "پارٹی" "امارت" کی تابعدار بنائی گئی۔

مولانا کا مقصود اصلی یہ تھا کہ ہندوستان کی ہر اسمبلی اور کانسل کا مسلمان ممبر اس پارٹی عہد نامہ کا تابع اور پابند ہو کہ مجالس آئین ساز میں وہ کسی خلاف شریعت بل، تحریک یا تجویز کی تائید نہیں کریگا۔ اور ایسے مسائل میں ہمیشہ امارت کی تصریحات اور احکام کی پابندی کریگا۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مولانا نے خاص امارت کی ایک سیاسی پارلیمنٹری پارٹی مجالس آئین ساز پر قبضہ کرنے کے لئے تعمیر کی اور اس کا نام مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی رکھا۔ اس پارٹی کا عام ملکی پروگرام کانگریس سے مختلف نہیں تھا۔ لیکن اسلامی پروگرام امارت شرعیہ کے نظام شرعی کے استحکام اور مسلم حقوق و مفاد کی حفاظت پر مشتمل تھا۔

مولانا نے اس سیاسی پارٹی کو کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ میدان سیاست سے تمام حریفوں کو جو اُن کی امارت شرعیہ کی سیاسی آمریت کی حیثیت کے منکر تھے، ہٹا دیا جائے خواہ وہ اور لحاظ سے کتنے ہی لائق اور فائق کیوں نہ ہوں۔ اور ان کی خدمات ملی و ملکی کا درجہ و مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ رہا ہو۔

اسی بنیاد پر، مولانا سجاد صاحب نے مولانا شفیع داودی صاحب لیڈر مسلم کانفرنس،

(احرار پارٹی اور عزیز ملت سید عبدالعزیز لیڈر مسلم متحدہ پارٹی سے جنگ کی اور اُن کی طاقتوں کو توڑنے کے لئے ایسے لوگوں سے اتحاد کرنے سے کبھی پرہیز نہیں کیا جو خود اُن کے نزدیک داؤدی صاحب اور عزیز صاحب سے ہزار درجہ بدتر تھے اور جو بالکل ابن الوقت مطلبی تھے اور جن کو حقیقت میں دین وملت سے دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اور جو انتہائی درجہ کے رجعت پسند، سرمایہ دار، خود غرض اور زمانہ ساز ٹوڈی رہے تھے، اور جن کو "انڈیپنڈنس" (INDEPENDENCE) استقلال" اور امارت اسلامی کی تحریکوں سے کبھی کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

مولانا نے ایک طرف اپنے حریفوں کی قوتوں کو اپنی حکمت عملی سے مجتمع و متحد ہونے سے باز رکھا اور اپنے کارڈ اس طرح کھیلے کہ غیر کانگریسی مسلمان جو کمیونل اوارڈ کی حمایت اور امارت کی آحریت کی مخالفت میں متحد تھے، دو علحدہ ٹولیوں یعنی احرار پارٹی اور مسلم متحدہ پارٹی میں بٹ گئے۔ پھر احرار پارٹی اور مسلم متحدہ پارٹی میں تصادم اور ٹکر ہوگیا۔ دوسری طرف امارت کی نام نہاد مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے امیدواروں کا انتخاب مولانا سجاد نے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ کر بالکل عملی سیاست کے اصول پر کیا اور ہر اُس شخص کو امارتی امیدواری کا پروانہ دیدیا۔ جس نے امارت کے عہدنامہ پر دستخط کیا، اور جو گانٹھ کا پورا اور عقل کا اندھا اسامی تھا اور جس نے اپنی زمینداری اور سرمایہ داری کی طاقت، جوڑ توڑ کی اہلیت اور دسیسہ کاری کی قابلیت سے اپنی کامیابی کی امید دلائی۔ مولانا نے باستثنائے چند ایسے لیسے امیدوار بھی کھڑے کئے

جو سخت جان ٹوڈی، سیاہ دل سرمایہ دار، ظلم پیشہ زمیندار اور اخلاق باختہ رئیس زادے تھے اُن کا معیار انتخاب جیسا کہ عرض کیا گیا صرف دو تھا (۱) اولاً امارت شرعیہ کو تمام دوسری سیاسی طاقتوں کے مقابلے میں بدرجہ اولیٰ قبول کرنے پر آمادگی، اور (۲) ثانیاً الیکشن کے میدان مقابلہ میں روپیہ، طاقت، سرمایہ داری، زمینداری، جوڑ توڑ یا پیری فقیری کے زور سے کامیاب ہو جانے کی صلاحیت۔ الیکشنوں میں وہ تمام خرافات اور تدابیر کو جائز رکھا گیا جو مغربی سیاست کے امتیازی نشانات اور مغربی تمدن کے مسلمہ مقاصد مانے جاتے ہیں۔

مولانا سجاد نے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا لیڈر ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو سائمن کمیشن کے سامنے ایک روز ایک نام نہاد بہار مسلم اسوسی ایشن کے مسلم نمایندہ کی حیثیت سے جداگانہ انتخاب کی حمایت کا وکیل بن کر پیش ہوا تھا اور دوسرے روز بہار زمیندار ایسوسی ایشن کے نمایندہ کی حیثیت سے مخلوط انتخاب کے کیس کا وکیل ہوا تھا۔ اور جس پر اسٹیٹسمین میں بجا طور پر یہ لکھا گیا تھا کہ صاحب مذکور ایک پروفیشنل پلیڈر اور پیشہ ور ایڈوکیٹ کی حیثیت سے کمیشن کے سامنے پیش ہوئے تھے۔ یہی شخص تھا جو اب اسمبلی میں کانگریس کی کامل آزادی کے پروگرام اور امارت کی تابعداری کا بھی عہد کر رہا تھا، اور دوسری طرف کانگریس اور امارت دونوں کے اصول کے خلاف وار کمیٹی کا بھی ممبر تھا۔

مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے لئے جس نے کانگریس کے پروگرام اور کامل آزادی کے نصب العین

کے ساتھ اپنے اتحادِ عمل کا اعلان کیا تھا، ایک ایسے شخص کی پارٹی لیڈری کتنی غیر مناسب اور غیر موزوں تھی، ہر شخص پر آفتاب کی طرح روشن ہے۔ لیکن مولانا سجاد کا خیال تھا کہ وہ ایک دُنیا دار اور بینکر بیرسٹر کو اپنی امارت پارٹی کے غلبہ اور اپنے حریفوں کو زیر وزبر کرنے کے لئے بطور آلۂ کار استعمال کر رہے ہیں۔

یہ سوال کہ آیا "لیڈر" انڈیپنڈنٹ پارٹی، امارت کو اپنی سیاسی لیڈری اور غلبہ کے لئے بطور زینہ استعمال کر رہا تھا یا مولانا سجاد اس شخص کو امارت کے غلبہ کے لئے استعمال کر رہے تھے، ایک دلچسپ ترین سوال ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو استعمال کر رہے تھے، مولانا سجاد عام جماعتی اور امارتی مفاد کے لئے اور لیڈر مذکور خالص ذاتی لیڈری اور شخصی جاہ طلبی کے لئے ایک دوسرے کو استعمال کر رہے تھے اور دونوں ملت اسلامیہ کی عام جمہوری نہضت جدید کے باعث بالکل ناکام رہے۔

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے جو تاریخ حال کی حقیقت ہے، مولانا سجاد خود اس صورت حال کو بہترین اور خوشترین نہیں جانتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ ایک دفعہ امارت کی بالادستی کو دستورِ ملک اور حکومت کے اندر منظور و مستحکم کرانے کے بعد وہ امارت پارٹی کو خراب عناصر سے بھی پاک کرنے میں کامیاب ہونگے، پھر اُن کے لئے موقع ہوگا کہ وہ شرعی و اخلاقی اصول اور معیار کے مطابق لوگوں کا انتخاب کر کے لیڈر اور نمائندہ بنائیں۔ لیکن جب تک اُن کو مغربی الیکشن گردی اور مجلس آئین سے واسطہ ہے وہ اُن سے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی کے خلاف تھے،

وہ ضروری جانتے تھے کہ وہ ہر طریقہ سے اُن پر قبضہ کریں اور اگر اُن سے کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکیں تو کم سے کم اُن کے اندر کسی ایسی تحریک کو منظور نہ ہونے دیں جو شریعت اسلامی کی تخریب کا باعث ہو۔

یہ طریقہ کہاں تک صحیح تھا اُس پر آئندہ بحث ہوگی، لیکن مولانا کی امارت شرعیہ کے ماتحت ایک پارلیمنٹری پارٹی بنانے، الیکشن لڑنے، وزارت بنانے اور حکومت چلانے کی پالیسی کی یہ روشن ترین فیاضانہ تفسیر ہے، جو کی جا سکتی ہے۔

یہ مولانا سجادؒ کی عظمت کی دلیل ہے کہ وہ ایک غریب جھونپڑے میں پیدا ہوئے، غریب عربی مدرسوں میں چٹائیوں پر تعلیم پائی، لیکن ایک ایسی سیاسی پارٹی کے بانی ہوئے جس میں نوابزادے بھی تھے، لیکن جس نے دینی امور میں ایک امیر شریعت کی تابعداری کی بیعت کی تھی اور جس کے نمائندہ ان کی کارپردازی کی بدولت، بہار کے اولین وزارت عظمیٰ پر فائز ہوئے، حالانکہ خود بانی جماعت مولانا سجاد جس جھونپڑے میں پیدا ہوئے، اُسی میں فوت بھی ہوئے۔

مولانا سجاد نے امارت شرعیہ کی اس بالادست آمریت (OVER LORDSHIP) کو تسلیم کرانے کی غرض سے سبھوں سے جنگ کی اور سبھوں سے صلح کی، اسی کے لئے وہ مولانا شفیع داؤدی سے لڑتے رہے اور ان کو بہار کی سیاست سے علٰحدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا اور اسی کی خاطر عزیز ملت سید عبدالعزیز سے جنگ آزما رہے اور کچھ عرصہ کے لئے ان کو بھی سیاست سے علٰحدہ ہو جانے پر مجبور کر دیا۔ اسی امارت کی غرض سے مولانا نے کانگریس کی تائید کی اور اسی کے لئے انہوں نے بھی جُدا

ہوئے، اسی مقصد کے لئے عامۃ المسلمین کی خواہشات اور رجحانات کے خلاف بہار اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کی تنظیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے رہے اور مسلم بہار کے صف اتحاد کو پاش پاش کر دیا۔

مولانا سجاد اور لیگ کا دور جدید

مولانا عملی سیاست کا اتنا گہرا علم رکھتے تھے کہ وہ ان خیالی آئیڈیلسٹ مولویوں کی طرح محض تعصبات کی بنا پر لیگ اور اس کے اصول کے مخالف نہیں ہو سکتے تھے جن کا سرمایہ سیاست محض چند سوفسطائی کلمات ہیں۔ حقیقت میں مولانا دل سے لیگ کے موجودہ اصول، دعاوی اور مقاصد سے ہمدردی رکھتے تھے، بلکہ انکے وضع کرنے میں نمایاں حصہ لے چکے تھے پھر وہ لیگ سے کیسے الگ ہوئے، کیوں ہوئے؟ اور اس کا نتیجہ ان کی زندگی کے مرکزی نصب العین کے لئے کیسا ٹریجک اور اندوہناک ہوا، اس کا حقیقت پرستانہ مطالعہ ضروری ہے۔

مولانا ان علماء کے لیڈر تھے جنہوں نے مولوی ابو الکلام آزاد کے اس سوفسطائی پروپگنڈا کا زبردست مقابلہ کیا تھا جو ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کی دوہری غلامی کو انگلو ہندو سامراج کی صورت میں مسلمانوں پر مسلط کرنے کے لئے ہندو کانگریس کے سرمایہ سے جاری کیا گیا تھا، طبقہ علماء کے لئے اس کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ مولانا ابو الکلام اپنے سحر سامری سے جمعیۃ علماء کو مسحور کرکے اپنے ساتھ بہالے جائیں گے۔ لیکن مولانا سجاد نے نہایت عقلمندی اور قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے اس جہاد کا ساتھ دیا جو انہوں نے نہرو رپورٹ

کے خلاف جاری کیا تھا۔ مولانا جمعیۃ علماء کے لیڈروں کو لیکر آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اُس اجلاس میں بھی شریک ہوئے جو یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو بصدارت ہز ہائی نس آغا خاں دہلی میں منعقد ہوا اور جس نے نہرو رپورٹ کے مقابلے کے لیے وہ مطالبات وضع کیے جنہیں مسٹر جناح نے مارچ ۱۹۲۹ء میں چودہ نکات کی صورت میں ترتیب دیا۔

جب ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے پاس ہونے کے بعد مسلم کانفرنس کا دور ختم ہوا۔ اور علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی دعوت پر مسٹر محمد علی جناح نے انگلستان سے ہندوستان واپس آکر مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کرنے کی غرض سے مسلم لیگ کی لیڈری قبول کی تو مولانا سجاد اُن مولویوں میں شریک تھے۔ جنہوں نے مسٹر جناح کو جمعیۃ علماء کے جلسہ دہلی میں شرکت اور تقریر کرنے کی دعوت دی تھی اور ان کا خیر مقدم کیا تھا، پھر جب آل انڈیا مسلم لیگ کے فیصلہ کے مطابق مسٹر جناح نے آیندہ اسمبلیوں کے الیکشن کے لیے ایک آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ بنانا چاہا اور اس کے لیے مختلف صوبوں کے لیڈروں کو ۲۶، ۲۷، اور ۲۸ اپریل ۱۹۳۶ء کو دہلی میں جمع ہونیکی دعوت دی تو اس میں بھی مولانا سجاد شریک تھے۔

جب مسٹر جناح نے سری نگر کا شمیر سے آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے ممبروں کے نام کا اعلان کیا تو بہار کے ناموں میں مولانا سجاد کا نام سب سے اوپر تھا اور بہار کے باقی تین نمایندے خاص مولانا سجاد کی امارت پارٹی کے لوگ تھے یعنی قاضی احمد حسین صاحب شاہ مسعود احمد صاحب و سیّد عبد الحفیظ صاحب ایڈوکیٹ۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اس دور جدید کا حقیقی آغاز اس تاریخی جلسے سے شروع ہوتا ہے جو ۸ رجون ۱۹۳۶ء کو بمقام لاہور بصدارت مسٹر جناح منعقد ہوا، اس جلسے کے علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال روح رواں تھے بلکہ انہی کی علالت کے خیال سے جلسہ خاص لاہور میں کیا گیا تھا۔ یہ آل انڈیا مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کا اولین جلسہ تھا، اس میں مولانا سجاد مرحوم، مولانا کفایت اللہ صدر جمعیۃ علمائے ہند، مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ علمائے ہند اور مولانا حسین احمد صاحب قائدانہ حصہ لے رہے تھے۔ اس اجلاس اول نے مسلم لیگ کے دور جدید کا آغاز کیا، اور اس کا وہ پارلیمنٹری پروگرام وضع کیا جو آجتک اس کا پروگرام ہے کیونکہ اس کی تنسیخ کسی دوسرے ریزولیوشن کے ذریعہ اب تک نہیں کی گئی ہے۔

لیگ کا یہ پارلیمنٹری پروگرام، چودہ دفعات پر مشتمل تھا جس کی دفعہ اول کا لفظی ترجمہ مطابق ذیل :-

"مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت کرنا، تمام ایسے معاملات میں جو خالص دینی نوعیت کے ہیں، جمعیۃ علمائے ہند اور مجتہدین کی رایوں کو واجبی وزن دیا جائیگا۔"

لیگ کے پروگرام کی یہ دفعہ اول حقیقت میں مولانا سجاد صاحب کی تصنیف تھی۔

مولانا سجاد اور جمعیۃ علماء کی لیگ سے علیحدگی کا معمہ

اس سے ظاہر ہے کہ مولانا سجاد نہ صرف یہ کہ مسلم لیگ

کے جدید پروگرام کے خلاف نہ تھے، بلکہ اُس کے واضعین میں تھے، مولانا سجاد اور اُن کے ساتھی کیوں لیگ سے الگ ہو گئے۔ حالانکہ مسلم لیگ ۱۹۳۷ء میں اجلاس لکھنؤ کے بعد خود اُن کے خیال میں بھی ۱۹۳۶ء کی حیثیت اور مقام سے بہت زیادہ آگے نکل چکی تھی، اس سارے قصہ کا سب سے اندوہناک معمہ ہے، جس کا سلجھانا ضروری ہے :-

مسلم لیگ ۱۹۳۶ء میں جبکہ مولانا سجاد اور اُن کی جمعیۃ اس کے حامی تھے، ایک کاغذی انجمن تھی۔ لیکن لکھنؤ کے تاریخی اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ء کے بعد ایک حقیقی طور سے جمہوری نمایندہ تنظیم ہو چکی تھی جس کا خیر مقدم مولانا سجاد کو کرنا چاہیئے تھا۔

مسلم لیگ ۱۹۳۶ء میں ڈومینین اسٹیٹس کے کریڈ پر راضی تھی، لیکن لکھنؤ کے اجلاس کے بعد آزادی کامل اور مسلم آزادی کی حامی تھی اور یہ چیز لیگ کو مولانا سجاد اور جمعیۃ سے بہت قریب کرنے والی تھی، لیگ مذہبی معاملات میں جمعیۃ کی سیادت کو اپنے دستور اساسی کی رُو سے قبول کر چکی تھی، لہذا یہ کہنا کہ مسلم لیگ اپنے ۱۹۳۶ء کے اصول سے ہٹ گئی تھی اس لئے مولانا سجاد اور جمعیۃ علماء والے حضرات اس سے الگ ہو گئے "قطعی" غلط اور بے بنیاد ہو گا، پھر آخر مولانا سجاد لیگ سے کیوں الگ ہوئے، یہی ان کی زندگی کا بڑا معمہ ہے۔

حقیقت اصلی یہ ہے کہ مولانا سجاد نے لیگ کو اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی اور اکلوتی اولاد امارت کے لئے ترک کر دیا اور اسی کے لئے اپنوں سے جنگ مول لی اور ساری قوم کے رجحان عام کے خلاف اپنی علیحدہ پارٹی وضع کی، اس کو قائم کیا اور چلاتے رہے۔

اگر وہ ای پریس کرتے تو بھی غنیمت تھا، لیکن انہوں نے امارت کو کانگرسی جمعیۃ علماء کی کانگریسی سیاست کا کھلونا، اور مسلمانوں کی سیاست اور مفاد ملی کے مخالفین کا ایک ہتھ کنڈا بنا دیا۔

تنظیم کے متعلق دو خیالات کا تصادم

اصل یہ ہے کہ مسلم لیگ کے دورِ جدید کے آغاز کے بعد ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں میں دو مختلف سیاسی خیالات کا تصادم ہوا۔

(۱) ایک طرف عام و خاص مسلمانوں نے مسلم لیگ کی زیر قیادت اپنے استقلال ملی اور وجود قومی کی آزادی کو قائم کرنے کے لئے "تنظیم ملت بصورت "تنظیم جمہوری" کا طریقہ اختیار کیا۔ گو دینی امور میں علماء اور جمعیۃ علماء کے وجود کو بھی تسلیم کیا۔ اور اس چیز کی اپنے دستور اساسی میں تصریح کردی، اس جمہوری مسلم تنظیم نے جس کا نام اس وقت مسلم لیگ ہے، مسلمانانِ ہند کی مستقل اسلامی سلطنت کی صورت میں تنظیم کا نصب العین اختیار کیا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ اسلامیان ہند کی تنظیم اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک ملک میں اس کی اپنی آزاد مستقل سلطنت نہیں قائم ہوگی جو مسلم اکثریتوں کی محافظ اور مسلم اقلیتوں کی ضامن نہ ہو، (۲) دوسری طرف علماء کے ایک خاص طبقہ میں، جو کانگریسی سیاست سے متاثر تھا اور اپنے آپ کو قومیت متحدہ ہند کے موہوم مُذہب باطل کی طرف دعوت دینے کیلئے مامور تصور کرتا تھا، یہ خیال جڑ پکڑ رہا تھا کہ مسلمانوں کی تنظیم صرف بصورت امارت شرعی ہونی چاہیئے۔ یہ طبقہ علماء جس کے امام مولانا سجاد تھے ایک طرف ہندوستان کو جمہوری نیشن اسٹیٹ بنانا چاہتا ہے، اور دوسری طرف اس نیشن اسٹیٹ

میں ایک امارت شرعی بھی قائم کرنا چاہتا ہے، اور ایک شخص کو امیر شریعت مان کر اس کے ہاتھ پر سب سے بیعت لینا چاہتا ہے، اور سب مسلمانوں کو اس کی اطاعت پر مجبور کرنا چاہتا ہے بلکہ اس کی بیعت و اطاعت کو شرعاً فرض و واجب بھی بتاتا ہے۔ یہ خیال کتنا متضاد اور بے جوڑ عناصر سے مرکب ہے، اور ملت کے لئے کتنا خطرناک ہے آگے عرض کرونگا۔

بنیاد اس خیال کی یہ عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کی قیادت اور سیاسی رہنمائی کا حق "علماء" اور صرف اصطلاحی علماء کے لئے مخصوص ہے اور ہونی چاہیئے، اور کسی غیر "عالم" کو حق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کے رہنما ہونے کا دعویٰ کرے، خواہ وہ کتنا ہی لائق و فائق، دیندار و متقی، مخلص اور ملت کا خدمت گزار کیوں نہ ہو۔ "عالم" کا اصطلاحی مفہوم اس فرقہ کے خیال میں بہت ہی محدود تھا۔ "عالم" سے مراد نصاب نظامیہ کا ایک سند یافتہ مولوی تھا۔ ان کے خیال میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ جیسا شخص بھی جو بہت سے مولویوں سے اسلام کا زیادہ گہرا علم رکھتے تھے اور ساری زندگی غلبۂ اسلام کے لئے جہاد کرتے رہے تھے "عالم" نہیں تھے اور نہ جمعیۃ علماء کی صدارت کے لائق تھے، اگرچہ جمعیۃ علماء کی تاسیس میں اُن کا سب سے بڑا حصہ تھا، اور مولویوں کو مدرسوں اور خانقاہوں سے نکال کر لیگ اور کانگریس کے اسٹیج پر لانے کے ذمہ دار بھی وہی تھے۔

یہی بنیادی اور اصلی سبب تھا مولانا حسین احمد اور مولانا سجاد کی لیگ سے علٰحدگی کا۔ یہ حضرات مسٹر جناح کو اپنا لیڈر ماننے کے لیے تیار نہیں تھے حالانکہ جناح ان کو اپنا مذہبی رہبر

تسلیم کر چکا تھا۔ لیکن یہ مسٹر گاندھی کے زیر آمریت کانگریسی ستیہ گرہ میں شرکت کے لئے راضی تھے حالانکہ نہ مسٹر گاندھی نے ان کی امارت شرعی تسلیم کی ہے اور نہ مذہبی سیادت قبول کی ہے، اور نہ ان کو کانگریس کی سیادت میں شریک کیا۔ بلکہ کانگریس کو کلیتاً مسٹر گاندھی کے اختیار میں دیدیا گیا ہے اور مسٹر گاندھی کو کانگریس کا آمر مطلق بنادیا گیا ہے۔ اگر یہ حضرات یہیں تک بس کرتے تو بھی غنیمت ہوتا۔ لیکن انہوں نے اس سے آگے اقدام کیا، عام مسلمانوں کی تنظیم و تحریک سے علحدگی اختیار کرنے کے بعد انہوں نے جمعیتہ علمار کی لیڈری میں مسلمانوں کو جمع کرنے، عام مسلمانوں کی جمہوری تنظیم کی مخالفت کرنے اور سب کو کانگریسی سیاست کے تابع بنانے کی جدوجہد بھی شروع کردی، گویا وہ مسلمانوں میں قومیت متحدہ کے مذہب جدید کے ایجنٹ ہیں۔ جمعیتہ علمار کے حالیہ جلسوں میں کانگریس کی موجودہ ستیاگرہ، جو آزادی ملک کے لئے نہیں بلکہ انگریز کو تمام غیر ہندو اقوام کے علی الرغم کانگریس کو ہندوستان کے مختار مطلق ماننے پر مجبور کرنے اور ہندو اکثریت کے غلبہ و استبداد کے قائم کرنے کے لئے جاری ہے، تائید کا اعلان کیا گیا، اور مولانا سجاد کا آخری مضمون جو اخباروں میں شائع ہوا وہ کانگریسی تحریک ستیہ گرہ کی تائید میں شائع ہوا، حالانکہ مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کانگریسی تحریک مسلمانان ہند کے وجود اور استقلال کو مٹانے کے لئے جاری کی گئی ہے۔

مولانا سجادؒ امارت کی تعمیر اور اس کا حشر

مولانا سجاد کی زندگی کا محبوب اپنے

دورِ حیات میں جس محور پر گھومتا رہا وہ اسلامی مرکزیت کی فکر اور اس کی پیدائش کے لئے تعمیری جد وجہد کا محور تھا، اور مولانا نے ہندوستان میں اسلامی مرکزیت کی تعمیر و تخلیق کے لئے جو صورت تجویز کی تھی، وہ امارت شرعیہ کی تاسیس تھی، امارت شرعیہ مولانا سجاد کی زندگی کا شاہکار تھی، امارت شرعیہ کا تصور اور تخیل فی نفسہٖ صحیح ہے یا غلط ہے، محل نظر ہو سکتا ہے، لیکن مولانا آزاد کے بعد بلکہ عملی لحاظ سے اُن سے بھی زیادہ اگر امارت شرعیہ بہار کے قیام میں کسی کا حصّہ ہے تو مولانا سجاد صاحب کا ہے جنہوں نے اپنی ساری زندگی اسی خیال کی عملی خدمت و اشاعت میں صرف کر دی کہ مسلمانوں کی تنظیم بصورت امارت شرعی ہونی چاہیئے۔ مولانا کی ذات خود ایک انسٹی ٹیوشن تھی، اور امارت شرعی کا تخیل اس انسٹی ٹیوشن کا بنیادی تخیل تھا۔

امارت شرعیہ کی تنظیم میں کس کا دماغ کارفرما تھا؟

امارت شرعیہ کا تصور صحیح ہے یا غلط؟

امارت شرعیہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی یا ناکام؟

امارت شرعیہ کی نوعیت اور حقیقت واقعتاً کیا تھی اور اس کی علمی تعریف و تحلیل کیا ہو سکتی ہے؟

امارت شرعیہ اگر ناکام ہوئی تو کیوں اور کیسے؟

امارت شرعیہ کی تنظیم، طاقت، افادیت کس پوزیشن میں ہے اور اس کے لئے کیا ہو سکتا ہے؟

امارت کا مسئلہ مولانا سجاد کی زندگی کا مسئلہ تھا اور مذکورہ سوالوں کا جواب مولانا کے مسئلہ زندگی کا حل ہوگا۔ اور اس بات کا بھی فیصلہ کردیگا کہ مولانا کی زندگی کامیاب ہوئی یا ناکام۔ لیکن ان سوالات کا جواب مولانا سجاد کی زندگی کا حقیقت پرستانہ مطالعہ چاہتا ہے جس کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو ابتدا سے اس تخیل اور تنظیم کے ساتھ ہمدردانہ رہا ہے اور اس کے باوجود عام حالات سے ذہنًا الگ ہوکر رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

میں اس کا مدعی ہوں کہ امارت شرعیہ کی ابتدا سے میں نہ صرف اس کا حامی رہا، بلکہ عملًا بہت سے مواضعات میں اس کی تنظیم و تحریک کے لئے دورہ کرتا رہا ہوں، اور اس سے زیادہ یہ کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں تنظیم شرعی کی سیاسی ضرورت پر مسلسل سوچتا اور لکھتا رہا ہوں، اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا سیاسیات، اجتماعیات، قانون و دستور اور تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے وسیع گہرا اور مسلسل مُطالعہ کرتا رہا ہوں۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی کئی اہم تجاویز کا جو اس کے متعلق پاس ہوئی تھیں، میں مصنف تھا۔ آل انڈیا مسلم یونٹی لیگ کے پلیٹ فارم سے اس کے لئے انگریزی اور اُردو میں مسلسل پروپگنڈا کرتا رہا اور اس مقصد کے لئے جس کا نام میں نے "استقلال نظام شریعت اور شرعی سوراج" رکھا تھا، حضرت علامہ سر محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ، علامہ ڈاکٹر سر عبد اللہ المامون السہروردی، حضرت مولانا قاری محمد سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ پھلواری شریف، مفتی امین الحسینی

مفتی اعظم فلسطین جیسے اکابر علم و سیاست سے بھی براہ راست مشورہ و مذاکرہ کرتا رہا تھا۔ اس مسئلہ کے متعلق حضرت علامہ اقبال کی خاص تحریرات بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ حضرت مولانا حکیم عبدالرؤف صاحب قادری داناپوری اور مولانا شفیع داؤدی صاحب جیسے بزرگان قوم، ہماری اس مقصد کے لئے ناچیز جد و جہد سے واقف ہیں۔ اس موضوع پر انگریزی اور اردو میں جتنا اس ناچیز نے لکھا ہے، اتنا شاید کسی دوسرے شخص نے نہیں لکھا ہوگا۔ اور سیاسی و ذہنی لحاظ سے جتنوں کو مسلم یوتھ لیگ کے پروپگنڈا کے ذریعہ اس کی مخالفت سے حمایت پر آمادہ کیا گیا غالباً کسی اور ادارے سے نہیں ہوا ہوگا، لہٰذا مخالفین لیگ بھی کم سے کم اس امارت شرعیہ کے متعلق ہماری رائے کو دیانتدارانہ یقین فرمائیں گے اور اس کو کسی تعصب کا نتیجہ قرار نہیں دیں گے، بلکہ تلخ تجربات اور زندگی بھر کے مخلصانہ اور حقیقت پرستانہ غور و فکر کا نتیجہ یقین فرمائیں گے۔

امارت شرعیہ کی تخلیق و تعمیر میں مولانا سجاد کا قائدانہ حصہ ہندوستان میں اسلامی فکر سیاست کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ مولانا سجاد کا مقام اس تاریخ میں یہ ہے کہ برطانوی عہد حکومت ہند میں غدر ۱۸۵۷ء کے بعد، یہ مولانا ہی کی ذات تھی جس نے سب سے اول اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ مولانا سجاد نے امارت شرعیہ کی تاسیس میں اپنی قیادت فکری و عملی کے تمام جوہر دکھائے، اور اگر وہ اس امارت کو خالص شرعی معاملات کی تنظیم تک محدود رکھتے اور اس کو ملت اسلامیہ ہند کی عام سیاست سے منقطع نہیں کرتے یا کم سے کم اس کو کفار و مشرکین ہند کی مخالف اسلام سیاست وقتی

کا کھلونا نہیں بننے دیتے تو یقیناً ان کی تاسیس ان کے بعد بھی ایک مفید ملت انجمن کی حیثیت سے زندہ رہتی اور مسلمانوں کی آزادی کامل کے جہاد میں ان کی معاون ہوتی۔ لیکن ایمانداری کی بات یہ ہے کہ مولانا سجاد کی امارت شرعیہ جہاں تک جمہور مسلمین کی وابستگی کا تعلق ہے مولانا سجاد کے مرنے کے پہلے ہی مر چکی تھی۔

تحریک خلافت کے زمانے میں مولانا شاہ بدر الدین صاحبؒ کے زمانے میں مولانا سجاد صاحب کی قیادت کے ماتحت امارت شرعیہ کی تنظیم مخصوص ادارات کے ساتھ کی گئی تھی۔ بہار کے اکثر مواضعات اور امصار میں اس کے نقیب اور عمال، مبلغین اور ناظرین مقرر کئے گئے تھے، زکوٰۃ، صدقات، عشر وغیرہ کے وصول کرنے اور بیت المال میں جمع کرنے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ قومی محصول کی تشخیص بھی گاؤں گاؤں عمل میں لائی گئی تھی۔ مسلمانوں کی مردم شماری کی گئی تھی، اکثر ضلعوں میں دار القضا قائم کیا گیا تھا۔ مقدمات شرعی کا فیصلہ شرعی اصول سے کیا جاتا تھا۔

امارت کا اختلال و انحلال

لیکن افسوس کہ شاہ بدر الدین احمد رحمتہ اللہ علیہ امیر اول کے انتقال کے بعد امارت شرعیہ برائے نام امارت رہی اور حقیقت میں مولانا سجاد کی ذاتی سیاست اور کانگریسی پارٹی یا کانگریس کا کھلونا بن کر ختم ہو گئی حتی کہ آج اسکی گمراہی، اپنے مقصد اصلی سے بے پروائی اور عام مسلمانوں سے بے تعلقی اور کفار سے دوستی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ:-

(۱) امارت کا صرف نام ہی نام باقی رہ گیا۔ نہ گورنمنٹ برطانیہ نے اس کو تسلیم کیا۔ نہ کانگریس

نے اس کے اصول اور نظام کو قبول کیا اور نہ اب وہ مسلمانوں میں کوئی تنظیم کی حیثیت سے زندہ ہے۔

(۲) شاید ہی کسی گاؤں میں اس کے نقیب باقی ہوں۔

(۳) دارالقضاء کی شاخیں تمام ضلعوں میں ختم ہو چکی ہیں۔

(۴) عاملین اور محصلین کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔

(۵) مبلغین کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے اور جو دو ایک مبلغ موجود ہیں وہ دینی تبلیغ میں مصروف نہیں ہیں، بلکہ لیگ کی مخالفت، پاکستان کی تردید اور کانگریسی سیاست کی تبلیغ کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

(۶) بیت المال بھی دم توڑ چکا ہے، قوم کو اس پر کوئی اعتماد باقی نہیں رہا ہے اس میں کوئی رقم نہیں ہے۔

(۷) امارت شرعیہ کے کسی دستور اساسی اور کانسٹی ٹیوشن کا علم کسی کو نہیں ہے اور اگر کسی کاغذ پر اس کا وجود ہے، تو اس پر عمل نہیں ہوتا ہے۔

(۸) امارت شرعیہ کی کوئی ایسی مجلس شوریٰ نہیں ہے جو ملت کی نمائندہ کہلانے کی مستحق ہو۔

(۹) امارت کا جو تھوڑا بہت اثر باقی ہے وہ امارت کے نام سے نہیں ہے بلکہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے مریدوں اور معتقدوں کی جماعت کے باعث ہے، بلکہ حق یہ ہے کہ امارت کا صرف نام ہی نام باقی ہے، جو کچھ ہے وہ خانقاہ ہی ہے۔

(۱۰) مولانا سجاد کے انتقال کے بعد اب امارت کے جسد مُردہ میں نہ دماغ باقی ہے نہ دل، نہ رُوح باقی ہے اور نہ خونِ زندگی، ایک بے جان ڈھانچہ کا سایہ یا ڈھوت رہ گیا ہے، اور وہ بھی آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔

امارت کا تصوّر فی نفسہٖ غلط، غیر اسلامی اور خطرناک تھا

میں نے زندگی بھر امارت شرعیہ کے خیال کی تائید کی، لیکن اب اپنے تجربات کی روشنی میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ امارت شرعیہ کا تصور فی نفسہٖ غلط، غیر اسلامی اور خطرناک تھا، بنا بریں امارت شرعیہ کو اللہ نے ساقط اور ناکام کیا، اور مسلمانوں کو ایک بڑی گمراہی سے بچا لیا۔ اس لحاظ سے مولانا سجاد کی زندگی ناکامی کی ایک المناک ٹریجڈی ہے۔

امارت شرعیہ کا تصور اس اصول پر مبنی تھا کہ اگر کسی ملک میں مسلمان سیاسۃً غیر مسلموں کے محکوم اور غلام بن جائیں تو ان کو لازم اور ضروری ہے کہ ایک مسلمان "عالم" کے ہاتھ پر بیعت کرکے اس کو اپنا امام بنالیں اور اس کی رائے کے مطابق اپنے امور شرعی کو انجام دیں اور اسکی اطاعت کو قبول کریں اور اس طرح اپنی محکومیت پر نہ صرف قانع ہو جائیں بلکہ اپنی محکومیت کو ایک آئینی صورت اور شرعی شکل بھی دیدیں۔

(۱) اولاً امارت شرعیہ کا یہ تصور اصلاً غلط ہے، کیونکہ یہ اپنے وجود کے لئے ایک اسٹیٹ کے اندر (IMPERIUM IN IMPERIO) "حکومت در حکومت" کا نظام فرض کر لیتا ہے

اور حکومت در حکومت" کا وجود عہد حاضر کے کسی اسٹیٹ خصوصاً کسی جمہوری اور نیشن اسٹیٹ کے اندر ناقابل قیاس، ناقابل تصور اور ناممکن الوجود ہے اور نیشنل ساورینٹی کے اصل الاصول کی نفی پر مبنی ہے۔

(۲) ثانیاً امارت شرعیہ کا تصور اصلاً غیر اسلامی ہے کیونکہ امارت کا نظام بغیر کامل طاقت تنفیذی ایک پائی پائیرٹ سے بھی بد تر چیز ہے اور امارت بے طاقت اور پاپائیرٹ کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے، ایک ایسی امارت بے طاقت کا تصور جو محض مولویوں کے ذاتی خیالات پر مبنی ہو اور جو بالکل غیر مسلم حکومت وقانون کے رحم وکرم پر ہو، ایک بدعت کا تصور ہے جسکی کوئی سند قرآن وحدیث میں نہیں ہے، کیونکہ قرآن وحدیث میں مسلمانوں کی محکومیت اور غلامی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، اور نہ محکوم مسلمانوں کی حالت محکومیت کے لئے کوئی نظام محکومیت برنبائے شریعت موجود ہے۔

اسلام کے پاس اگر تلوار اور شریعت کی طاقت نہیں تو وہ ایک رہبانی تصوف سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے، اسلام کا شرعی نظام صرف ایک دینی سلطنت کی طاقت (SANCTION) کے ذریعہ جاری ہو سکتا ہے۔ امارت، سلطنت کے سوا، اور سلطنت کے باہر اور کوئی چیز نہیں ہے۔ سلطنت ہی کا نام امارت ہے اور امارت ہی کا نام سلطنت ہے، سلطنت کے علاوہ امارت کا تصور محکوم ہندی مسلمان کے محکوم دماغ کا محکومانہ مخلوق ہے، لہذا ایک بے طاقت امارت کا تصور، اساساً، اصلاً اور جوہراً غلط، بے بنیاد اور انتہائی گمراہ کن تصور ہے۔

(۳) ثالثاً ایک محکوم اور غلام شخص کے لئے محکوم قوم کا امیر و مطاع مطلق ہونے کا دعویٰ کرنا خطرات کا حامل ہے۔

مسلمان اپنا ایک آزاد جمہوری امام صرف اپنی مکمل طاقت اور سیادت کو قائم کرنے کے لئے ایک وقتی جہاد استقلال کے آلہ کار کے طور پر اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک ایسے امیر کے لئے امیر المومنین اور مسلمانوں کے مطاع مطلق ہونے کا دعویٰ کرنا نہ صرف غلط بے بنیاد اور بے سند دعویٰ ہے بلکہ انتہائی خطرناک بھی ہے، کیونکہ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلمان اور اسلام محکوم اور کمزور ہیں اور جہاں کفار کو غلبہ حاصل ہے، ہر وقت اس کا خطرہ ہے کہ کافر طاقتیں اپنی ڈپلومیسی سے اس مجبور مسلمان پوپ کو اپنے زیر اثر لیکر اپنے اغراض سیاسیہ کے لئے استعمال کرینگی جس طرح انہوں نے جنگ عظیم کے بعد محکوم شیخ الاسلام استنبول اور محکوم خلیفۃ المسلمین قسطنطنیہ کو آزاد ترکان انقرہ کے خلاف اور شریف حسین کو آزاد خلیفہ ترکی کے خلاف، ملّائے رسولی مراکشی کو امیر عبدالکریم کے خلاف اور ہندوستانی کے نام نہاد علمائے امارت و علمائے جمعیۃ کو خود اسلامیان ہند کے استقلال ملّی کے خلاف استعمال کیا اور کر رہی ہیں۔

حق یہ ہے کہ اسلامی زندگی کا صرف ایک ہی تصور قابل قیاس ہے اور وہ ایک آزاد انسان کا تصور ہے، جو خدا و رسول کی غیر مشروط اطاعت مطلقہ کے بعد صرف ایک ایسے اولو الامر کی مشروط اطاعت کا پابند ہو جو خدا و رسول کی شریعت کو زندگی کا بنیادی

دستور العمل اور کانسٹی ٹیوشن تسلیم کرچکا ہے اور اس دستور کو ساری دنیا سے تسلیم کرانے کے لیے ساعی ہو اور اس کی اہلیت بھی رکھتا ہو، اور اس معنی میں مسلمانوں کے اندر سے ہو کر ملت نے آزادانہ طاقت و اختیار کے ساتھ اس کو قائم کیا ہو اور کسی غیر مسلم طاقت کا اس پر سیاسی اثر نہ ہو۔

امارت پھلواری کی نوعیت وحقیقت کی علمی تحلیل اور تجزیہ

لیکن غور فرمایئے کہ امارت پھلواری کی اصل حقیقت اور حقیقی نوعیت کیا ہے، اور اس کا وجود کن عناصر سے مرکب ہے۔ امارت کو کیا ہونا چاہیے اُس سے بحث نہیں ہے، فی الحقیقت وہ اس وقت کیا ہے یہ اصل دیکھنے کی چیز ہے۔ سوال ہے کہ امارت ہے کیا؟ آیئے اور امارت کی شخصیت کی علمی تحلیل کیجیے۔ ہم امارت کا تجزیہ ان سوالات سے بخوبی کرسکتے ہیں:۔

(۱) کیا امارت ایک سلطنت، یا اسٹیٹ ہے؟

(۲) کیا امارت ایک سلطنت در سلطنت (IMPERIUM IN IMPERIO) کا نظام ہے؟

(۳) کیا امارت ایک سلسلۂ تصوف یا نظام خانقاہیت (MONASTIC ORDER) ہے؟

(۴) کیا امارت ایک انجمن اور یونین ہے؟

(۵) کیا امارت ایک لمیٹڈ کمپنی یا جائنٹ فیملی بزنس فرم ہے؟

(۶) کیا امارت کسی مامور من اللہ اور معصوم عن الخطا شخص کی روحانی و سیاسی خلافت ہے؟

امارت پھلواری شریف کو کوئی بھی سلطنت نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی یعنی (۱) ملک (۲) آبادی (۳) عام و مطلق حاکمیت (۴) اور عام و لامحدود قوت تنفیذی میں سے ایک جز بھی اس کے قبضے میں نہیں ہے۔

امارت "سلطنت در سلطنت" کا بھی نظام نہیں ہے، کیونکہ اب تک نہ اسٹیٹ نے اسکے وجود کو قانوناً تسلیم کیا ہے اور نہ کم سے کم اس کے مخصوص دائرۂ عمل میں اس کی محدود خود مختاریت AUTONOMY اور محدود طاقت تنفیذی ہی کو مانا ہے، جیسا کہ کاپیچولیشن (CAPITULATIONS) کے نظام کے ماتحت سلطنت عثمانیہ ترکی کی بہت سی غیر مسلم ملّتوں اور غیر ملکی فرنگی قوموں کے لیے محدود سلطنت عثمانیہ کے اندر مخصوص دائروں میں تسلیم کیا جاتا تھا اور جو بے شمار مفاسد کا سرچشمہ بن گیا تھا اور جس کو معاہدۂ لازین ۱۹۲۲ء کے ماتحت ترکان احرار اور کمال اتاترک نے ختم کیا۔

امارت اور خانقاہیت کا فرق

امارت ایک سلسلۂ تصوف یا نظام خانقاہیت "موناسٹک آرڈر" بھی نہیں ہے کیونکہ اصلاً تصوف ایک انفرادی اور شخصی چیز ہے اور امارت اصلاً ایک اجتماعی، عمومی اور سیاسی چیز ہوتی ہے، ایک مخصوص سلسلۂ تصوف سے جو شخص اعتقاد قلبی رکھتا ہے اُس سے متوسل

ہوتا ہے اور اس کے طریقہ کے مطابق چلکر اپنی روحانی ارتقا کی کوشش کرتا ہے خواہ وہ طریقہ خدمت خلق کا کوئی اجتماعی طریقہ ہی کیوں نہ ہو لیکن جوہراً یہ چیز کاملاً شخصی وانفرادی نوعیت کی ہوتی ہے اور خاص ذاتی عقائد اور خاص ذاتی اصول پر اس کے کیف وکم کا مدار ہے مثلاً ایک شخص کو ایک شیخ سے اعتقاد ہوتا ہے دوسرے کو دوسرے سلسلۂ تصوف سے ربط ہوتا ہے اور تیسرے کو کسی اور سے! یہ بالکل ذاتی عقیدہ اور شخصی اعتقاد پر منحصر ہے۔ کسی سلسلہ کا شیخ یا مرشد کبھی دوسروں کو اپنی بیعت پر مجبور نہیں کرتا ہے اور سب کو لازماً اپنے دائرہ عمل ودخل میں لانے کی کبھی کوشش نہیں کرتا ہے۔ اور دراصل یہ طریقہ تصوف نہیں ہے۔

امارت برعکس اس کے سب سے لازماً اپنی اطاعت کی بیعت لینا اپنے وجود کے لئے لازمی اور ضروری شرط اول سمجھتی ہے۔ امارت کا سارا تصور ہی یہ ہے کہ طوعاً وقہراً ہر مسلمان پر امارت اور امیر کی بیعت واجب ہے، اور جو شخص بغیر بیعت مرجائے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ پھلواری شریف کی امارت نے اپنے لئے اسلامی خلافت کے ان تمام مذکورہ حقوق کا دعویٰ کیا تھا۔ مولانا سجاد کی امارت دعویدار تھی کہ ہر مسلمان پر اس کے امیر کی بیعت لازم واجب اور فرض ہے اور جو بغیر بیعت مریگا وہ جاہلیت کی موت مریگا۔ قرآن وحدیث کے وہ تمام احکام جو خلافت اسلامی کے لئے اترے ہیں، مولانا سجاد کی امارت اپنے لئے استعمال کرتی تھی۔

پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ ابتدا ہی سے امارت شرعیہ بہار کو عملاً ایک خاص سلسلہ تصوف اور ایک مخصوص حلقۂ خانقاہ سے وابستہ کردیا گیا تھا امارت شرعیہ بہار کے امیر اول شاہ بدرالدین احمد صاحب

کو منتخب کیا گیا تھا، جو خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین اور ایک نہایت عالی پایہ بزرگ تھے۔ لیکن مجھے ان کی ذات سے بحث ہی نہیں ہے، بلکہ امارت شرعیہ بہار کی علمی و سیاسی نوعیت سے بحث ہے۔

امارت شرعیہ کے دوسرے امیر شاہ بدرالدینؒ کے خلف الرشید صاحبزادہ مولانا شاہ محی الدین صاحب ہوئے جو خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے سجادہ نشین بھی ہیں، گویا عملاً شاہ بدرالدین کے بعد امارت شرعیہ بہار، خانقاہ مجیبیہ بہار اور خاندان سجادہ نشین کے ساتھ وابستہ کردی گئی، اس وابستگی کو الیکشن کے موقعوں پر خوب خوب استعمال کیا گیا۔ اتنا اور اس طرح کہ عام مسلمانوں کے لیے خانقاہ پھلواری شریف کے احکام اور امارت شرعیہ کے احکام میں تمیز کرنا دشوار ہو گیا، کیونکہ یہ دونوں ادارات عملاً وحقیقتاً ایک ہی ذات میں مجتمع ہو گئے تھے، جو ایک خانقاہ نشین، صوفی وعالم کی ذات تھی، جن کے خانقاہ کے معمولات میں سے ایک عجیب معمول یہ ہے کہ وہ سجادہ نشین ہونے کے بعد خانقاہ کے حلقہ اور احاطہ سے زندگی بھر باہر نہیں نکلتے ہیں۔

ایک خانقاہ نشین سجادہ نشین کی خانقاہیت کے ساتھ، ایک سیاسی و شرعی امارت کی وابستگی، خواہ کتنی ہی بے جوڑ اور غیر مناسب کیوں نہ ہو۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ بہار میں ایسا ہی کیا گیا اور ایسا ہی ہوا۔

امارت کسی معصوم عن الخطا امام یا مامور من اللہ کی خلافت کبھی نہیں ہے، اور نہ اس کا دعویٰ کیا گیا ہے، اور نہ کوئی سُنی مسلمان کبھی ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔

لیمیٹڈ کمپنی اور امارت تو پھر کیا امارت شرعیہ ایک جائنٹ فیملی بزنس فرم یا لمیٹیڈ کمپنی ہے؟

آئین و قانون کی رُو سے اس میں بعض خصائص لمیٹیڈ کمپنی اور فیملی فرم کے ضرور ہیں لیکن اس کے حالات پر اُن کی تعریف بھی مشکل سے پوری طرح صادق آتی ہے۔

اجتماعیات کی روشنی میں امارت کی تحلیل علوم اجتماعیات (سوشیالاجی) اور قانون کے ایک طالب علم کے لئے امارت شرعیہ پھلواری شریف کی اصلی نوعیت و حقیقت اور صحیح تعریف کا تعین کرنا ایک مشکل کام ہے، لیکن میں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ امارت شرعیہ نہ تو کوئی اسٹیٹ ہے، اور نہ "سلطنت در سلطنت" کا نیم دولتی و نیم خود مختار نظام ہے، اور نہ امارت کسی مامور من اللہ یا خدائی فوجدار کی خلافت ہے، اور نہ کوئی سلسلہ تصوف یا نظام خانقاہیت ہے۔ بلکہ ایک عجیب الخلقت "انجمن" اور "ایسوسی ایشن" کے سوا کچھ نہیں، جس میں کئی باتیں ایسی ہیں، جو خلاف معمول اور غیر معمولی ہیں۔

امارت ایک ایسی "انجمن" ہے:۔

(۱) جس کی صدارت کا منصب حین حیاتی اور عملاً و حقیقتاً ایک خاندانی اور دراثتی عہدہ ہے،

(۲) اور جس کی ممبری کا دروازہ تو عوام پر بند ہے یعنی ہر خاص و عام اس کا ممبر نہیں ہو سکتا لیکن

(۳) جسکے مقصود اور وظیفہ عمل کے متعلق دعوئے عمومیت کے ساتھ ہر عقیدہ اور ہر خیال کے

مسلمانوں کو وعیدات قرآنی سے ڈرا کر اپنے امیر کی بیعت عام اور اطاعت عام پر متحد و منظم کرکے سب پر شرعی محصولات کی تشخیص کرنا، بیت المال قائم کرنا، عدالت و دار القضا کے ذریعہ انصاف کرنا اور امور شرعیہ کا انصرام و اہتمام کرنا اور بالعموم خلافت کے فرائض انجام دینا ہے، اور

(۴) جس کے قانون اساسی اور دستور العمل کو (اگروہ موجود ہے) نہ عام مسلمانوں نے بنایا ہے، اور نہ وہ اس سے آگاہ ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ امارت پھلواری:۔

(۱) چند اشخاص،

(۲) چند ادارات،

(۳) چند قوانین،

(۴) چند املاک و اموال،

(۵) چند دعاوی اور

(۶) چند اعمال و اشغال،

کے عناصر اور اجزاء سے مرکب ہے۔

اشخاص، میں اس کے چند عہدہ دار مثلاً امیر شریعت، نائب امیر شریعت، قاضی، مبلغ، ناظم، مدیر اخبار و ملازمین اور اس کے وہ متوسلین شامل ہیں جو اس سے عقیدہ رکھتے ہیں اسکی

بیعت کرتے ہیں یا اس کو عشر، زکوٰۃ، صدقات اور قومی محصول طوعاً یا قہراً ادا کرتے ہیں۔

"ادارات" میں اس کے وہ دار القضا، بیت المال وغیرہ شامل ہیں جن کے موجودہ اختلال کا حال ہم معلوم کر چکے ہیں اور جو ایک وقت میں موجود تھے اور اب عملاً ختم ہو چکے ہیں۔

"قوانین" سے وہ تمام تحریریں یا رواجی قواعد و ضوابط مراد ہیں جن کے مطابق یا خلاف امارت کا کاروبار جاری تھا اور ہے۔

"دعاوی" سے مراد وہ تمام اعلیٰ آرزوئیں اور تمنائیں ہیں جو امارت شرعیہ کے قائم کرنے کی محرک ہوئیں۔ اور بطور مقاصد اس کے لئے قبول کی گئی تھیں، اور وہ تمام احکام حقوق اور فرائض خلافت بھی مراد ہیں جن کے وارث ہونے کی دعویدار امارت شرعیہ ہے اور جن کا تذکرہ ابھی ابھی ہو چکا ہے۔

"املاک و اموال" سے مراد وہ قابل انتقال یا ناقابل انتقال اسباب اور سامان ہے جو انجمن مذکور کے فنڈ یا ملکیت میں ہے۔

"اعمال و اشغال" سے امارت کے وہ کام مراد ہیں جن کا حال ہم پہلے معلوم کر چکے ہیں۔

انجمن امارت پھلواری کا سرمایۂ حیات مذکورہ عناصر کے سوا اور کیا ہے؟

انجمن امارت کے امیر کو نہ تو عام بیعت کے ذریعہ تمام مسلمانوں یا اکثر مسلمانوں نے اپنا خلیفہ یا امیر تسلیم کیا ہے، اور نہ امیر مذکور نے قہراً اپنی سیادت و امارت کو تلوار کے زور سے منوایا ہے، اور نہ عام مسلمانوں نے ان کا انتخاب کیا ہے، اور نہ اہل حل و عقد مسلمانوں کے کسی معین

نمایندہ" مجلس نے اُن کا انتخاب کیا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ:۔

(۱) اپنی تاسیس اور ترکیب کے اعتبار سے امارت پھلواری ایک انجمن اور ایسوسی ایشن یا یونین ہے۔

(۲) لیکن اپنے دعاوی اور مقاصد کے لحاظ سے ایک "سلطنت" اور "خلافت" کے اختیارات اور حقوق کی دعویدار ہے گو اس میں اسٹیٹ کی ایک خصوصیت اور اختیار بھی موجود نہیں ہے' اور

(۳) اپنے بعض خصائص واعمال کے اعتبار سے ایک خانقاہی نظام ہے' اور

(۴) اپنے بعض حالات کے اعتبار سے ایک فیملی لمیٹڈ کمپنی ہے۔

الغرض امارت ایک عجیب الخلقت انجمن ہے جو حقیقت میں چند محدود و مخصوص شخصوں کی ایک حین حیاتی لمیٹڈ کمپنی ہے جو بیعت عام' اطاعت عام' سیادت عام اور امر عام کے وہ دعوے بھی پیش کرتی ہے جو صرف ایک آزاد وخود مختار سلطنت کا آزاد بادشاہ اسلام اور خلیفۃ المسلمین ہی پیش کر سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر امارت' ایک انجمن کے خول پر ایک مذہبی سلطنت کی قبا منڈھنے کی ناکام اور زبردستی کوشش کے سوا کچھ نہیں ہے۔

سقوط امارت کے اسباب

خدا نے امارت شرعی بصورت انجمن خانقاہی کی

بدعت کو جس کی کوئی سند قرآن، حدیث اور تاریخ دین میں موجود ہے، ناکام اور ساقط کیا۔

انجمن امارت کے سقوط کامل کے اسباب کی تشریح حسب ذیل طریق سے ہوسکتی ہے:-

(۱) اولاً مولانا سجاد، امارتی علماء اور جمعیۃ علماء والے ایک طرف ہندوستان کو ایک نیشن اسٹیٹ بنانا چاہتے تھے، اور قومیت متحدہ کے مذہب یعنی نیشنل ازم کے مبلغ بن گئے تھے، اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کی امارت شرعیہ اور استقلال ملی کے بھی دعویدار تھے، نیشن اسٹیٹ اور نیشنل ساورنیٹی کا بنیادی سیاسی مذہب اسلام کے عقیدہ توحید کی طرح ایک ہمہ گیر محیط کل (TOTALITARIAN) عقیدہ ہے جس کے مطابق نیشن اسٹیٹ کی حاکمیت ہر چیز پر مطلق اور غیر محدود تسلیم کی جاتی ہے اور نیشن اسٹیٹ کے اندر کسی دوسری طاقت کا اس کا حریف تسلیم کیا جانا قطعی غلط اور ناممکن ہے۔ بجائے دیگر مسلمانوں کی امارت شرعی کا تصور اصلاً ہندوستان کے نیشن اسٹیٹ کے اندر ایک دوسری نیشن اسٹیٹ کی تخلیق و تعلیق کا تصور ہے۔

بنابریں ہندو سبھا اور نیشنل کانگریس نے جو اس ہندوستان کو ایک وحدانی نیشن اور نیشن اسٹیٹ بنانے کے دعویدار ہیں، آج تک بااختیار امارت شرعیہ اور آزاد بااختیار نظام قضا کے اصول تک کو تسلیم نہیں کیا ہے، حالانکہ جمعیۃ علماء اور امارت نے کانگریس کی حمایت میں اپنا وجود تک مٹا دیا ہے۔ حقیقت میں کانگریس ایسا کر بھی نہیں سکتی ہے۔ کانگریس نیشنل ازم کے لئے امارت شرعی کو ماننا اپنے وجود کا انکار کرنا ہوگا۔

الٰہ آباد کی اتحاد کانفرنس سنہ ۱۹۳۲ء میں علمائے جمعیۃ و امارت نے بہت زور و رواں کے ساتھ اس مطالبہ کو پیش کیا، کانگریس کے سامنے بھی جمعیۃ نے بار بار یہ مطالبہ رکھا لیکن آخر تک نہ اس کو تسلیم کیا گیا اور نہ کیا جائیگا جب تک ہندوستان کا ایک نیشن اور ایک متحدہ نیشن اسٹیٹ کا تصور باقی ہے کیونکہ نیشنل ازم اور امارت شرعیہ اصولاً ایک دوسرے کی ضد اور نفی ہیں۔

(۲) ثانیاً جمہور مسلمان، امارت ٹولی اور جمعیۃ علما پارٹی کی گمراہی اور کانگریس نوازی یعنی نیشن اسٹیٹ، کے کانگریسی نصب العین کی تائید کو اپنے وجود ملی کے لیے مہلک خطرہ یقین کرتے ہوئے عملاً ان سے سخت بیزار اور الگ ہو گئے اور امارت اور جمعیۃ والے بھی کانگریسی تحریک رابطہ عام کی تائید کرنے، جمہور مسلمانوں کی جمہوری تنظیم اور استقلال ملت کے نصب العین سے منقطع ہو گئے بلکہ عام مسلمانوں کی تحریک کی مخالفت کرتے رہے اور پاکستان کے مطالبہ کا مذاق اڑاتے رہے۔

عامۃ المسلمین امارتی علماء سے اس لئے بیزار ہو گئے کہ یہ امارتی علماء مسلم نیشنل ازم یعنی ہندوستان میں مسلمانوں کی اپنی آزاد و مستقل سلطنت کے تعمیر کرنے کے نصب العین یعنی تعمیر پاکستان کے خلاف ہیں اور مسلمانوں کو ایک ہندو اسٹیٹ کا محکوم بنانا چاہتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور اور قرار داد پاکستان کے پاس ہو جانے کے بعد مولانا سجاد نے شد و مد سے اس کی مخالفت کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مالیاتی لحاظ سے

یہ اسکیم ناقابلِ عمل ہے۔

زمارِقی اور جمعیتِ علماء اس لیے جمہور مسلمین کی تنظیم عام یعنی مسلم لیگ اور پاکستان سے منقطع اور بے زار ہو گئے کہ یہ چیز کانگریسی نیشنلزم اور قومیتِ متحدہ کے اصول کے بالکل خلاف ہے اور وہ اب تک ہندوستان کو ایک نیشن اسٹیٹ کی صورت میں تعمیر پر عقیدہ رکھتے ہیں، حالانکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ نیشن اسٹیٹ دراصل ہندو راشٹر یا رام راجیہ کے سوا اور کچھ نہیں ہو گا۔ دراس میکانیکل ریاضیاتی جمہوریت اور پارلیمنٹری نظام کے ماتحت جس کا دارومدار سروں کی گنتی اور ریاضی کے ہندسوں پر ہے۔ مسلمانوں کی حیثیت ایک دائمی اقلیت اور محکوم غلام کی ہو گی۔ اور مسلمانوں کے ساتھ اس صورت میں وہی کچھ ہو گا جو اسپین میں عربوں اور موروں کے ساتھ اور جرمنی میں یہودیوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔

امارتِ شرعیہ کے اختلال کا سب سے محکم سبب اس کا ملت سے یہی انقطاع اور دشمنانِ ملت سے یہی موالات و اتحاد ہے۔

(۳) امارت کی ناکامی و بربادی کا تیسرا اہم سبب یہ ہے کہ درسِ نظامیہ کے فارغین اور علمائے دیوبند میں سے بعض حضرات میں ایک عجیب سیاسی و نفسیاتی انقلاب پیدا ہوا ہے، جس کو لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے
نہ آفس میں تھے اور نہ کرسی میں تھے

یہ ٹھہرا کہ آپس میں مل جائے
سیاسی کمیٹی میں چل جائے
اسی روشنی کا ہے بس یہ ظہور
خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور

مُلّا کراسی یا مُلّا شاہیت ایک جملہ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ سیاسی مولویوں کے مخصوص و محدود گروہ میں یہ خالص دُنیادارانہ اور غیر اسلامی عقیدہ پیدا ہوا کہ ملت کی رہنمائی اور سیادت کا حق شرعاً انہیں کے لئے مخصوص ہونا چاہیے اور اُن کا استحقاق حکومت محض ان کی سندِ "عالمیت" پر مبنی ہے۔ اُن کی نگاہ ابتدا؟ تنفیذ شریعت پر نہیں بلکہ سیاسی اقتدار پر قابض ہونے پر ہے۔ ان کے نزدیک حکومت و سیادت کا حق طبقۂ علمار کے لئے منصوص اور مخصوص ہے اور کسی غیر عالم کے لئے سیادت و امارت ناجائز ہے۔

"امارت" اس طرح ایک نئی قسم کی افلاطونی آرسیٹوکراسی (ARISTOCRACY) (حکومت اشراف) کی صورت بن گئی جس کو اگر میں مُلّا کراسی (MULLACRACY) "مُلّا شاہیت" کے نام سے موسوم کروں تو بیجا نہ ہوگا۔ جس طرح افلاطونی جمہوریت میں حکومت و سیادت صرف حکیموں اور فلاسفروں کے طبقہ کے لئے مخصوص رکھی گئی ہے اسی طرح جمعیۃ علمار اور امارت شرعیہ کی ٹولی کے نزدیک مسلمانوں کی حکومت و سیادت سندی علمار کی ٹولی کے لئے مخصوص رکھی گئی ہے۔

ہندوستان کی موجودہ سیاست کے اندر جمعیۃ علمار ہند نے بعض علمار کی ایک ٹریڈ یونین کی

پوزیشن اختیار کرلی ہے جس طرح ایک مخصوص ٹریڈ یونین ایک مخصوص پیشہ وروں کے مفاد اور کلاس انٹرسٹ کے لئے کام کرتی ہے اور طبقاتی شعور اور احساس اور طبقاتی تعصب کے ساتھ کام کرتی ہے اسی طرح جمعیۃ علماء درس نظامیہ کے سند یافتوں کے طبقاتی مفاد اور عصبیت کی حفاظت اور اس کی ترقی کے لئے کوشاں ہے۔

اس طرح اصطلاحی علماء کی ایک علحدہ کاسٹ اور جداگانہ کلاس پیدا کی جارہی ہے جن کا کام خالصاً لوجہ اللہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد کرنا نہیں بلکہ اعلاء کلمۃ "جمعیۃ" و غلبہ امارت تحفظ کے لئے مسلمانوں سے جنگ کرنا، مسلمانوں کی آزاد سلطنت کی تحریک کی مخالفت کرنا، اور ہندو رام راجیہ کے لئے مسلمانوں کے خلاف جدوجہد کرنا قرار پایا۔

اگر یہ امارت خالص اسلامی سلطنت کے نصب العین اور مسلم مفاد کے لئے ملت کے ساتھ مل کر کام کرتی، اور للّٰہیت کے ساتھ کام کرتی اور قانون اہلیت کے مطابق ہر کام کے لئے اس کے واقعی اہل شخص کو مقرر کرتی، خواہ وہ سندی عالم ہو یا غیر عالم، تو قوم از خود امارت کو بلا طلب اپنا سردار تسلیم کرتی، لیکن جبکہ یہ امارت ایک طرف عملاً مسلمانوں کو رام راجیہ ہندو راشٹر یا ہندو نیشن اسٹیٹ کے محکوم بنانے کی ہندو کوشش میں بھی شریک ہے اور دوسری طرف اپنے لئے اپنی خدمت کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض اپنی عالمیت اور تقدس مآبیت کی بنیاد پر سیادت طلب کرتی ہے، تو مسلمانوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنی دینی و دنیاوی کی قیمت ادا کر کے برہمنیت اور پاپائیت کی بدعت کو خریدیں، اور اپنے اوپر مسلط کریں۔

(۴) امارت شرعیہ کی ناکامی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ابتدا ہی سے وہ ایک خانقاہی نظام کے ساتھ جوڑ دی گئی۔ اور خانقاہیت اور سیاست کا جوڑ ایک اَن مِل جوڑ ہے اِس سے دونوں کے دائروں کو صدمہ پہنچا اور بہت زیادہ نقصان ہوا۔

(۵) امارت شرعیہ مسلمانوں کے ایسے مستقل شرعی، معاشرتی اور دینی امور کے انجام دینے کے لئے وجود میں لائی گئی تھی جن کے انجام دینے کے لئے ایک طرف طاقت تنفیذی کی ضرورت تھی، تو دوسری طرف تقسیم وظائف کے اصول پر سختی سے عمل کرنے کی ضرورت تھی لیکن ملت سے گستگی کے باعث امارت کو نہ طاقت تنفیذی حاصل ہو سکی اور نہ اس کے شرعی امور اور وظائف کے دائرہ عمل کی کبھی تعریف و تحدید کی گئی۔ امارت کو ہر معاملے اور ہر مضمون میں الجھا دیا گیا، اور سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کو ملک کی پارٹی پالٹیکس، ہنگامی سیاست، اور فرقانہ پروپگنڈا کا اس طرح آلہ کار بنا دیا گیا کہ دار القضاء، بیت المال، نظام محصلین، صدقات و زکوٰۃ، نظام نقباء و عاملین، سب ادارات اُن کے سیل رواں میں تنکوں کی طرح کہ آج اُن کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ نام نشان ہی باقی ہے۔

مولانا سجادؒ امارت اور جمعیۃ کی زندگی کی ٹریجڈی

مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ امارت شرعیہ اور جمعیۃ علماء ہند، کی زندگیوں کی ٹریجڈی یہ ہے کہ انہوں نے اپنا دورِ حیات کفرستان ہند میں اسلام کے نظام مرکزیت کی تاسیس کے مقصد کے ساتھ شروع کیا۔ اور اُن کا خاتمہ عملاً پاکستان

یعنی ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی تعمیر کی مخالفت اور ایک کفر و اسلام کی ممزوج متحدہ قومیت کی تکوین کی کوشش اور متحدہ نیشن اسٹیٹ کی تخلیق کی حمایت کرتے ہوئے ہوا۔ اتنی اچھی ابتدا کی اتنی بری انتہا قیاس میں نہیں آسکتی ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے لیکن اس کو بیان نہ کرنا حق ناشناسی ہوگی۔

مولانا سجاد نے شروع میں ایک کافر اسٹیٹ کے فولادی خول کے اندر امارت شرعیت' کی حکومانہ پوزیشن طلب کی تھی۔ لیکن قوم اس درجہ اور اس پوزیشن سے بہت آگے نکل گئی۔ ملت اسلامیہ ہند کی نہضت جدید نے اپنے لئے اس ملک میں ایک آزاد مستقل اور خود مختار اسلامی سلطنت تعمیر کرنے کا نصب العین پیدا کیا۔ لیکن وہ جس نے اس کا خواب دیکھا تھا بظاہر اسکی مخالفت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوا۔

یہ انتہائی افسوسناک ٹریجڈی ہے۔ لیکن حضرت مولانا قمر الدین صاحب قمر کے واسطہ سے مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ مولانا سجاد صاحب اپنی پرائیوٹ مجلس میں یہ فرماتے تھے کہ "پاکستان ہی وہ نصب العین ہے جو مسلمانان ہند کا صحیح سیاسی نصب العین ہو سکتا ہے، البتہ ہمارا اعتراض صرف یہ ہے کہ یہ قبل از وقت پیش کیا گیا ہے۔"

اگر یہ روایت صحیح ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالات و واقعات نے جن کا وہ سنجیدگی سے بغور مطالعہ کیا کرتے تھے، مولانا کو متحدہ قومیت اور متحدہ نیشن اسٹیٹ کی تعمیر سے اسی طرح مایوس کر دیا تھا جس طرح مولانا شوکت علی اور مسٹر جناح جیسے نیشنلسٹ مایوس ہو چکے تھے،

اور مولانا محسوس کر رہے تھے کہ پاکستان کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہو گا۔ غالباً جمعیۃ علماء کی پارٹی پالیٹکس یعنی مولانا حسین احمد صاحب صدر جمعیۃ علماء کا غلو اور ضد ان کو اس حقیقت کے اعلانیہ اعتراف سے روکتی رہی، ورنہ یہ تو ظاہر ہے کہ ساری جمعیۃ علماء کے اندر مولانا سجاد ہی مسلم لیگ سے سب سے زیادہ قریب تھے، کانگریسی وزارتوں کے مظالم اور گاندھی ازم کے خلاف آپ نے جو جنگ جاری کی تھی وہ اس کا ثبوت تھی کہ مولانا کانگریس سے مایوس ہوتے جا رہے تھے، اور اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ مولانا حسین احمد کی جمعیۃ کے ناظم نہ ہوتے تو غالباً وہ اپنے اس انقلاب ذہنی کا اعلان بھی کر دیتے۔

یہ ایک المناک ٹریجڈی ہے کہ مولانا سجاد جیسی اعلیٰ ترین تنظیمی صلاحیت اور اولین درجے کی سیاسی قابلیت مسلمانوں کے لئے ضائع گئی، ان کی زندگی کا حاصل (۱) امارت شرعیہ (۲) اور مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی تھی، لیکن آج نہ تو امارت باقی ہے اور نہ اس کی مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی باقی ہے۔ دونوں کا صرف سایہ ہی سایہ باقی رہ گیا ہے۔ نہ مسلم لیگ مولانا کی غیر معمولی قوتوں سے قوت حاصل کر سکی، اور نہ امارت کو حقیقت میں کوئی حقیقی اور استقلال حاصل ہو سکا۔ مولانا ملت اور ملک دونوں کے لئے کھو گئے۔ آخر میں وہ بظاہر قومیت متحدہ اور پاکستان کے درمیان کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکے اور ٹھیک ٹھیک صاف طور سے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ واقعی کانگریس کے وحدانی نیشن جمہوری کو مانتے ہیں یا مسٹر جناح کے ٹو نیشن تھیوری کو قبول کرتے ہیں۔ ڈکٹیٹری اور پارٹی پالیٹکس کے طوفان میں مولانا سجا

خود اس طرح گرفتار ہوئے کہ ان کی زندگی کا شاہکار بھی اُن کے ساتھ بلکہ ان کی زندگی ہی میں ختم ہو گیا۔

اس بیسویں صدی میں مولانا سجاد اسلامی مرکزیت اور اسلامی امارت کے ہندوستان کے اندر سب سے بڑے داعی کی حیثیت سے اسلامی سیاست کے مبلغ اکبر تھے لیکن افسوس اس کا ہے کہ وہ نیشنل ازم، نیشن اسٹیٹ، پارلیمنٹری جمہوریت، الیکشن گردی کا تسلسل، منسٹری اور سوراج کے افرنگی اور ہندو سیاست کے سیل رواں میں اس طرح بہہ گئے کہ اُن کے ساتھ ان کی اسلامی سیاست و امارت بھی بہہ گئی۔

لیکن انشاء اللہ اب پوری ملت اسلامیہ ہند جس میں مولانا سجاد کے تربیت دادہ بہت سے بیش بیش ہیں ہندوستان میں ایک آزاد و مستقل اسلامی مرکزیت کو قائم کرنے اور مولانا مرحوم کے حقیقی نصب العین کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں کامیاب ہوگی۔ لامرکزیت دور ہوگی مولانا کا خواب تقدیر الٰہی کے مطابق پورا ہوگا۔ اور ہندوستان ایک اسلامستان بن کر رہے گا۔ کیونکہ جیسا کہ مولانا کا اصلی عقیدہ تھا اس ملک کی نجات نہ تو پراچین بھارت کے دھرم راشٹر یا میں ہے اور نہ نوین بھارت کی گاندھیت اور رام راجیہ میں ہے اور نہ افرنگی سیاست کی پارلیمنٹری جمہوریت یا اشتراکیت، نازیت و فسطائیت میں ہے بلکہ اس کی حقیقی حریت صرف سلطنت اسلامی کی تعمیر اور نظام تمدن اسلامی کی تاسیس میں ہے اور اسی کے لئے یکسوئی کے ساتھ مولانا کے تمام خلفا اور متوسلین کو سعی کرنا چاہیئے۔ کیونکہ

آزاد و خود مختار اسلامستان کی تعمیر اسلامی مرکزیت کے اس داعی اکبر کی بہترین و موزوں ترین یادگار ہوگی۔

قوم اور اس کے علماء، زعماء، عوام اور خواص سب کے سب رخ اس اسلامستان کی طرف پھر چکے ہیں، سب اس کی طرف چل پڑے ہیں، سب آہستہ آہستہ خودنگری اور خودشناسی کی راہ سے خودیابی کی اس منزل کی طرف گامزن ہیں، جاہلیت، خود فراموشی اور غلامی کی تاریک، ڈراونی رات صبح ہو رہی ہے۔ سپیدۂ سحری نمودار ہو چکا ہے، امید کی کلی کھل رہی ہے، آفتاب استقلال ملت اسلام مشرق سے طلوع ہو رہا ہے اور اس کی روشنی میں ملت کی آزادی کے مینار اور کنگورے صاف دکھائی دے رہے ہیں، مایوسی کی سیاہی کافور ہو چکی ہے، ایمان اور عزم کی طاقت، ملت آسمان کو چیلنج دے رہی ہے، زمین سے ٹکر لے رہی ہے، اور اس وقت تک چین نہیں لیگی جب تک اس آسمان کے نیچے اپنا مستقل مقام حاصل نہ کرلے۔

اللہ مولانا کو جوار رحمت میں جگہ دے، ان کی نیکیوں کو قبول کرے، ان کی غلطیوں کو معاف کرے، اور ان کے خلفاء کو ملت کے ساتھ ملکر اس سیاست و مرکزیت اسلامی کے غلبہ و قیام کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لینے کی توفیق دے، جو مولانا کا اصلی محور حیات تھا۔ آمین!

سرودِ رفتہ

(استدراک)

(از جناب شمس ہاشمی بہاری)

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید
(اقبالؒ)

مرتب "محاسن سجاد" کی مہربانی سے، مولوی راغب احسن صاحب سکریٹری کلکتہ مسلم لیگ کا مضمون چھپنے سے قبل حقیر کی نظروں سے گذرا۔ یہ مرتب "کتاب کی انتہائی دیانتداری ہے کہ انہوں نے لائق مضمون نگار کی طرادتِ فکر کو بلا تخفیف و تقریض[۱] اس مجموعۂ مضامین میں جگہ دیدی، حالانکہ بادی النظر میں "محاسن سجاد" کے ساتھ "معایب و مساوی سجاد" کا پیوند، تضاد مقصد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آج جبکہ ہم آزادی گفتار کا ایک نمونہ ہندوستان میں اور آزادی کردار کا ہولناک منظر یورپ میں دیکھ رہے ہیں تو ایک ایسی بات کی اشاعت سے

---

[۱] تقریض کے معنی 'کاٹ چھانٹ' کے ہیں۔ ام۔ع۔

گریز کرنا جو صحیح یا غلط طور پر ایک جماعت کہہ رہی ہو صداقت سے فروتر ہوگا۔ اسلئے "محاسن سجاد" کے گوشے میں اس نکتے کا محل نظر ہونا قابل برداشت ہونا چاہیئے۔ اور ہم ناظرین کتاب سے یہ استدعا کرنا چاہتے ہیں وہ صحیح سطح نظر سے اس پر غور فرمائیں گے اور جذبات کو دخل نہ دیں گے مگر یہ محسوس کرنا بھی فطرتاً ناجائز ہوگا کہ لائق مضمون نگار نے اس موقع اشاعت کو غنیمت سمجھکر ایک پرانے جوش انتقام کو ابھارنے کی ناجائز کوشش کی ہے۔ تاہم وہ بات جو کل کہی جائیگی کیوں آج نہ کہدی جائے' اور مسلمانان ہند عموماً اور مسلمانان بہار خصوصاً جس مسئلے پر لازمی طور پر فیصلہ کرنے پر کل مجبور ہونگے' اس کو آج ہی کیوں نہ چھیڑا جائے یہی مصلحت عملی مجبور کرسکتی ہے کہ ہم عامۃ المسلمین سے استدعا کریں کہ وہ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا شروع کردیں' وہ وقت یقینی آنے والا ہے جب مسلمانوں کو اس ماضی قریب پر فیصلہ کن رائے دینی ہوگی۔

ایک حصہ تو اذکار و اعتراضات کا ایسا ہے جس کا جواب امارت شرعیہ سے متعلق ہے اور کارکنان نظام مذکور کافی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس دعوت بے ہنگام کو قبول فرماکر ضیافت طبع کریں —— اس استدراک کی غرض صرف مغربی سیاست کے اس دلدل سے قارئین کو نکالنا ہے جو فاضل مضمون نگار نے سیلاب الفاظ و ہیجان تخیل و جوش سخن سے پیدا کردیا ہے۔

حقیقت تو صرف یہ ہے کہ وہ تمام دلیلیں جو "امارت شرعیہ" یا "سیاست سجاد" کی ناکامی

اور مخالفت میں پیش کی جا سکتی ہیں وہ علیٰ حالہٖ "احرار پارٹی" "یونائیٹڈ پارٹی" اور "مسلم لیگ" کے متعلق کہی جا سکتی ہیں، اور شاید مؤخر الذکر جماعتوں پر مجموعی طور پر زیادہ صادق آئیں گی ـــــ عامۃ الناس کو تمام واقعات کے مطالعہ کے لیے کچھ اور وقت کا انتظار کرنا ضروری ہے۔ حضرت مولانا سجادؒ کی زندگی آج ہر کہہ و مہہ کے لیے لائق تحسین و تقلید ہو چکی، اور مشیت ایزدی نے اس بوریہ نشین کی ذات کو اور اس کے حصول زندگی کو اسلامی سرمایہ بنا دیا جس کے تحفظ و اتلاف کا حق بلا شبہ قوم کو حاصل ہے لیکن اگر آپ صرف محاکمہ سخن پر بس کرنا چاہتے ہیں تو ابھی اس وقت کا انتظار کیجیے جبکہ وہ عزیزانِ ملت و قائدین اعظم و بطل احرار اپنی اپنی زندگیاں قوم کو سونپ کر مشاہدہ عام و جلوت خاص کی شمعوں کو گل کر چکیں ـــ اور قلم کی تراوشیں ان کی ساحر نگاہوں سے مسحور نہ ہونے پائیں۔ "حیات" و "عمل" کے معیار کا بازار اسی وقت کھل سکے گا۔ فَانْتَظِرُوا اِنِّی مَعَکُم مِنَ المُنتَظِرِین۔

باقی رہا نفس "اصول نظام امارت شرعیہ" اور "حریفان امارت" کا طرز مقابلہ ـــ تو کیا آج مسلمانان ہند کی کوئی ایسی سیاسی یا مذہبی جماعت بھی ہے جو "نظام امارت شرعیہ" کی بنیادی اینٹوں کو کھود کھود کر خود اپنی امارت کی تعمیر نہ چاہتی ہو؟ آپ "سلطنت در سلطنت" کے سیاسی تخیل پر ماتم کر سکتے ہیں ـــ مگر خود مسلم لیگ کا پاکستانی تخیل اس (IMPERIUM IN IMPERIO) "سلطنت در سلطنت" سے کچھ زیادہ نہیں ہے، اور سرد راتوں کی تاریکی میں خدا کی زمین و آسمان کے وسیع حلقے میں قائد اعظم کا دماغ،

"اسلامستان فی البرطانیہ" سے آگے نہ جاسکا! اگر اس سرمایۂ دل کی تصویر آپ دیکھنا چاہیں تو نواب زادہ لیاقت علی خاں کی آخری تقریر مرکزی اسمبلی میں پڑھکر فیصلہ کرلیں، اور قائداعظم کی تشریح پاکستان پر بھی غور کریں! — وہ قوم "امارت شرعیہ" کے نظام کے خلاف کیا کہہ سکتی ہے جس کا وجود اس دنیا میں "حکومت الٰہی" کے تخیل و تعلیم پر منحصر ہے؟ — آپ "تمسک بالقرآن" و "سنت رسول" سے یکسر باز آجائیں، اور مدار سیاست "عقل اجتماعیہ" "جمہوریۂ مرکبہ" کا اعلان کردیں، تو پھر کوئی محل مناظرہ باقی نہیں رہ سکتا۔ نظام سیاست وحکومت کا سوال، ایک قوم کی تاریخ کا سوال ہے۔ کسی مضمون نگار کے جوش تحریر کا نہیں، مسلمانان ہند ابھی مدت مدید تک اس امر پر غور کرتے رہیں گے کہ امارت شرعیہ کا تصور صحیح ہے یا غلط۔ لیکن فیصلہ "امارت شرعیہ کے نظام" کو محو و منسوخ کرنے کا اگر قوم کبھی بھی دیگی تو وہ دن اُس کی مذہبی زندگی کا آخری دن ہوگا جو تاریخ اسلام میں ایک "نیا کربلا" پیدا کردیگا۔ آخر حضرت امام حسینؓ بھی تو خلاف جمہوری آمادہ پیکار نظر آئے — مسلمانو! ووٹ کے اعتبار سے تو میدان کربلا میں ان کے صرف بہتر (۷۲) ووٹ تھے۔ اگر آپ کو شبہ ہو تو علامہ اقبال کی سند حاضر ہے۔

دشمناں چوں ریگ صحرا لاتعد

دوستانِ او بہ یزداں ہم عدد

پھر "اسلامی جمہوریت" کا ماتم کرنا کس قدر عجیب ہے۔ "اکثریت اور جمہوریت" پر بحث کیا ہے

ماتم کر لیجیے۔ نبی اُمّیؐ کی بعثت سے ایکبار تحال "سجادؒ" تک اکثریت نے "حق" کے خلاف بغاوت کی، اور "تمسک بالقرآن" کا استہزا کیا ـــ ھاتوا برھانکم! اور اب اس کے بعد آپ فیصلہ کریں کہ "امارت شرعیہ" کا نظام جس کو آج فرسودہ اور غلط کہا جا رہا ہے، کامیاب ہوا یا ناکام! ستم تو یہ ہے کہ جب مسلمان گمراہی میں غیر اسلامی طریقوں پر جا رہے تھے، اُن کو چند بوریہ نشین گداگروں نے جھنجھوڑا، جگایا، اُٹھایا، منزل مقصود کی طرف دوڑایا، اور جب وہ منزل کے قریب تر پہنچے، تو حوالی منزل کی روشن شعاؤں میں ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، اور وہمی جگمگی تصویروں اور متحرک شاہانہ جلووں کو دیکھ کر وہ اپنے رہبروں کو بھول گئے، اور تقسیم انعامات کے مبہم خطروں سے لرزاں ہو کر سزاولوں، برقندازوں اور توپچیوں کو اشارہ کرنے لگے کہ دیکھو یہ ٹکر گدا کہیں ہمارے محلوں میں در نہ آئے کہ "تا در نیائی در نیابی۔

ع لیگ والوں نے تراشا ہے بڑے نام کا بُت

آپ کہتے ہیں کہ "امارت کا نام ہی نام باقی رہ گیا ہے" نہ گورنمنٹ برطانیہ نے تسلیم کیا، نہ کانگریس نے" برادر من! مسلمانوں کو تو یہی "نام" کافی ہے۔ "تسلیم" کی حاجت نہیں۔ علامہ اقبال کو تو صرف "نام" ہی کی بقا نے زندہ رہنے پر مجبور کیا تھا۔ ع "ہم تو جیتے ہیں ترے نام کی عزت کیلئے" اگر امارت کا صرف "نام" ہی بقول مضمون نگار باقی رہ گیا ہے، تو بھی کیا کم ہے۔ ع کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے؟ آپ پھلواری شریف تشریف لائیں، تو دعوت نظر فرمائیں۔ آج امارت شرعیہ کا دفتر اپنے حلقہ مبلغین کی سعی و تدبر سے اس سے

زیادہ روحِ زندگی رکھتا ہے، جتنا "مسلم لیگ" یا دوسرے قومی مذہبی ادارے۔ یہ جسدِ خالی نہیں جس کو آپ "بے جان ڈھانچہ اور بھوت" کہہ کر تمسخرانہ طور پر جھٹلا دیں۔ اور پھکڑ الفاظ سے سبک کر دکھائیں۔ یہ اُن انجمنوں کے ڈھانچے پر صحیح اطلاق ہو سکتا ہے، جو "امارتِ شرعیہ" کے لئے حریفانہ قوتِ عمل کی تعمیر تھی۔ اور جس کی "امارت" کو فوقیت بخشنے میں "حریفانِ امارت" کی پوری کوششیں صرف ہو کر خسرانِ مبین کا اعتراف کر رہی ہیں — آج وہ کون صوبائی ادارہ ہے جس کے دفتر میں چراغ بھی روز نہیں جلتا؟ اس کا فیصلہ خود قوم کرے گی — آپ اُن تمام غریبوں کے پسینے کی کمائی کی رقموں کو جمع کریں جو قراردیں و لطیل عمائد کی کانفرنسوں اور کمیٹیوں کے جلسوں پر صرف ہوئے اور "ٹیلو پیلس" اور "دلکشا" کے تنعماتِ زندگی اور "ملیبار ہل" کی نزہت گاہ کے جاہ و جلال کی قیمتیں اور پھر "تشفیعِ منزل" کی "فقیرانہ" رجعت پر یکسر محاسبانہ نظر ڈال کر کامیابی اور ناکامیابی کا فیصلہ کریں۔ آخر میں اُس خالی تودۂ خاک پر جا کر فاتحہ پڑھیں جو پھلواری میں اب تا قیامت محوِ خواب ہو گیا۔ ع

سخن شناس نۂ دلبرا خطا ایں جاست

"سجاد" تو صرف ایک "نام کی عظمت" کے لئے جلتا تھا۔ اُسوۂ حسنہ اس کا مسلک تھا اگر وہ "زر و مالِ جہاں" پر مرتا تو "بُت فروشی" کے عوض "بُت شکنی" نہ کرتا۔ بلاشبہ اُس نے "قومیتِ مذہبیت"۔ "سیاستِ حریت" کے بُتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اور اگر آپ کو حُسنِ تلفظ ہی پسند ہے اور اس صنمکدۂ خیال سے باہر جانا نہیں چاہتے تو یہ تصور کرلیں کہ اُس نے "کعبۂ مقدس"

کا ایک بُت بنا کر قوم کی پرستش کے لئے پیش کر دیا۔ اور تقویم پارینہ پر قائد اعظم کی تصویر کو مسجود نگاہ حتی الوسع بننے نہ دیا۔ یہ فردِ جرم صحیح ہے۔ اور اب یہ مجرم بھی دار و رسن کی طاقتوں سے بلند تر ملائے اعلیٰ پر پہنچ کر ہماری بوالہوسی پر آج بھی افسوس کر رہا ہے۔ ع

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا؟

آپ شکایت کر سکتے ہیں کہ اس "کعبۃ اللہ" کی از سرِ نو تعمیر میں اس نے کچھ معمار ایسے بھی رکھے جن کا دینی اور قومی وقار مُسلّم نہ تھا۔ تو یہ قصور بہتر مزدور و معمار کا تھا جو حریفانہ جذبات سے متاثر ہو کر تعمیر میں شریک نہ ہوئے اور ایسی گراں اُجرت مانگتے رہے کہ جس کو دینا اِس تعمیر نو کا "قبل از تعمیر انہدام" یقینی تھا؟ یا اُس کا جس نے تخیئلی تعمیر کے لئے اقدام کیا۔ سالکانِ راہِ عمل ہمیشہ تعریف و توہین سے بے نیاز ہوا کرتے ہیں۔ یہ تنزل تو اُن بیکار افراد کی ہے جن کا ذاتی کعبۂ عمل خالی ہوا کرتا ہے اور جو دوسرے صاحب عزیمت انسانوں پر محتسب بن کر بیٹھنا ہی فریضۂ عمل سمجھتے ہیں۔ "امارت الیکشن بورڈ" کے قیام سے لیکر انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت تک کے واقعات ابھی بے کم و کاست صفحۂ قرطاس پر نہیں آئے اور "حریفانِ بادہ پیما" کی داستان ابھی تک "فردوس گوش" نہیں بنی۔ نہ یہ کوئی موقع ہے کہ ایک نئی "جنت نگاہ" ترتیب دیجائے، وقت آرہا ہے کہ "نئی محفل" سجائی جائے۔ اس وقت تو صرف آمادۂ نظر کرنا مقصود ہے۔ "مفتی اعظم" بیت المقدس سے لیکر "فرنگی محل" کے نوجوان صاحبزادے اور "وفد کھانہ بھون" کی تقریب سیاست بھی قائدین احرار و عزیزان ملت کو

سند سیادت و امارت سیاسی نہ بخش سکی اور تمام مقابلہ، مناظرہ و مجادلہ، مباہلہ و مغالطہ کی
گرم بازاریاں سرد پڑ گئیں۔ پھر بھی الزام "تمیز" تشخصیت و فضیلت انفرادی قائم ہے۔
اور ہمیں امید رکھنا چاہیئے کہ جبتک انسان کا فرسودہ قلم "اختلاف" کا لفظ لکھتا رہیگا۔
اس "نظام امارت شرعیہ" کی مخالفت ہوتی رہیگی۔ اور "عدل" و "تعدیل" کی سکون و خاموش منزل
صراط مستقیم و تمسک بالقرآن و رسول کی حد سے دور رہ جائیگی۔ مورخ کا قلم آجتک اورنگزیب
عالمگیرؒ کو کیا کچھ لکھ رہا ہے۔ ع یہ شکوہ ستم روزگار کیا کہیئے

ہمیں اعتراف ہے کہ "وزارت یونینسٹ" منتہائے مقصود نہ تھی، بلکہ خار راہ۔ مگر ہماری
تمام تر موجودہ سیاسی کوششیں اور چیخ و پکار کیا "وزارت عزیزی" "وزارت شفیعی" "وزارت
خلیق الزمانی" اور مرکزی وزارت نواب زادہ "زیر سایہ جناح" کے لیے نہیں ہیں؟ فضل الحق
کے سائے اور سکندر حیات کی طلب نے کونسا پوشیدہ چشمہ بقا ڈھونڈ نکالا؟ ع

یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری "اسلامستان" کا تخیل ابھی بہت
دور ہے ع پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی اور اس کا مصداق
جنگ ہندوستان میں محمد بن قاسم "فاتح سندھ" اور محمود غزنوی سے لیکر مستقبل ناپیدا کنار تک
وسیع ہے، لیکن "اجمیری" کی راہ پر چلنے والے اور "اسمٰعیل شہیدؒ" کے مقلدین اس جنگ زرگری کے
سپاہی نہیں — اگر "خویش کامی" کوئی دوسری اصطلاح نہیں بن سکتی اور تہذیب جدید کا
پرو پاگنڈائی مسلک آپ کو "فیملی ٹرسٹ ایسوسی ایشن" ہی کہنے پر مجبور کرتا ہے تو آپ آگاہ

ہو جائیں کہ اسلام نے یہ "فیملی برلنس ایسوسی ایشن" کا ئنات ذات ہی سے بنا رکھا ہے جس کا پہلا ڈائرکٹر ابراہیم بن آذر تھا (علیہ السلام) اور یہ سنگ تراشی "کعبۃ اللہ" کے خاتم معمار (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے اوپر ختم کر کے آیت تطہیر کی مہر لگادی اور اس صوبہ بہار میں حضرت یحییٰ منیری قدس سرہٗ اور اُن کے خلف اعظم حضرت مخدوم بہار نے پہلا سنگ بنیاد رکھا۔ سے نعرہ تکبیر سے جس کے کہستاں ہل گئے۔ نغمہ شیریں سے جس کے کفر و ایماں رنگئے

اور مبارک ہے ہر وہ ہاتھ جو اس اسلامی "بتخانہ" (اگر اس کو آپ کہنا پسند کریں، ورنہ ہم تو صرف "خلوت خانہ" ہی پر عقیدہ رکھتے ہیں) کی اینٹ پر اینٹ رکھتا جارہا ہے، اور امتداد زمانہ سے پیدا کئے ہوئے درازوں اور فرسودگیوں کو درست کرنے میں اپنی تمام متاعِ حیات صرف کردیتا ہے۔ ع تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلماں بھی ہو؟

آپ "ملا کراسی" اور "خانقاہیت" سے گھبرائیں نہیں۔ دنیا میں تو یہی ہو رہا ہے۔ "نئے ملا" نے صرف "نئی خانقاہ" بنائی ہے اور تمام تر سعی تلاش حلقۂ مریداں و سلسلۂ جنبانی بیعت ہی تو ہے۔ اس حمام میں بھی ننگے۔ اگر اس میں شبہ ہو تو قائد اعظم سے اس امر پر بیعت کر دیکھیے جس کو وہ نہ چاہیں اور "سواد اعظم" چاہے۔ کیا آپ نے ایسی مجلسیں بمبئی لاہور، لکھنؤ اور پٹنہ کے بند کمروں" میں ۱۹۳۷ء سے گذشتہ ماہ تک نہیں دیکھیں؟

فاعتبروا یا اولی الابصار!

عقل حیران ہے کہ "کانگریس" اور "گاندھی" کی غلامی کا طعنہ وہ دیتے ہیں، جو خود

غلامانِ غلام ہیں۔ وہ کونسی آزادیٔ عمل ہے جس کا نمونہ اس نشاۃِ جدیدہ میں مسلم لیگ یا کسی دوسرے قابلِ ذکر قومی ادارے نے دکھلایا ہے؟ "گاندھی ازم" پر "سجاد" سے بڑھ کر بھی کسی نے لب کشائی اور سخت تنقید کی ہے؟ اور اس صنم آبادِ ہند میں جہاں فانی زبان سے نکلے ہوئے فقرے "پاکستان" اور (TWO NATION THERY) "دو قوم" کے نظریے کی "کتاب اللہ" سے بھی زیادہ پرستش کی جاتی ہے، جہاں اس وقت مذہبی تحفظ کا سوال ہے نہ اعلائے کلمۃ اللہ کا، جہاں جہاد باللسان کا صحیح مفہوم بھی مفقود ہے، اور جہاد بالنفس اور مال کا وہم بھی باقی نہ رہا ہو، جہاں حمیری کے اعداد شمار پر، اور مردم شماری کی غلطیوں پر ہنگامے گرم ہوتے ہیں، نہ کہ "بدر و حنین" کی تقلید پر، اُس بُت پرست ہندوستان میں ابوالمحاسن محمد سجاد کے سوا اس دور میں کس نے کانگریس اور مہاسبھائی جمعیتوں کو بیانگ دہل یہ کہا کہ "کس سیاسی تحمل اور رواداری پر مسلمانانِ ہند اس ملک میں بُت پرستی کو برداشت کر رہے ہیں؟" کیا کاغذ کے وہ صفحے محو ہو گئے، یا قارئین کی نظروں تک نہیں پہنچے؟ آج بھی آپ اُس کو پڑھ کر سکونِ قلب حاصل کر سکتے ہیں، اور اسلامی "حرب سلمی" کا سبق نئے سرے سے پڑھ سکتے ہیں۔ ورنہ ذبیحہ گاؤ کے موقعوں پر بلووں کا شوق ایک طفلانہ تفریح ہو سکتی ہے، ایک قومی تعمیری اور استقلالی فن نہیں بن سکتا۔

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

فاضل مضمون نگار کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے "اعلائے کلمۃ اللہ" کے لئے نئے میدان کھول دئے ہیں، اور جو فکر و دماغ ابھی تھک کر سکون حاصل کر رہے تھے وہ وقت کی دعوت کو قبول فرمائیں اور لب کشائی کریں۔ "مسلکِ سجادؒ" اور نظام امارت شرعیہ یقینی مسلمانوں کی توجہ کے مستحق ہیں، اور یہ آیندہ مورخ اور سیرۃ نگار کا فرض ہوگا کہ وہ متنازعہ فیہ واقعات اور حقائق کو منظر عام پر لا کر مستقبل کو سپرد کر دے۔ "محاسنِ سجادؒ" کے محترم مرتب نے یہ بزم کلمۂ خیر کی ترتیب دی ہے جس کا دامنِ خیال بہت ہی تنگ ہے، اس لئے قلم رک رک کر چلتا رہا کہ مبادا راقم بھی اسی گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے جس پر استدراک کی لکیریں کھینچی جا رہی ہیں۔ اُنظر الیٰ ما قال ولا تنظر الیٰ مَن قال۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

مولاناؒ اور مجالس قانون ساز

(از مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی ام ال آ، مونگیر)

[مجالس آئین ساز اور اُن کے ذریعہ ملکی و ملّی مسائل کے سلجھانے کے سلسلہ میں مولانا سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے جو خدمات انجام دیں، ان کی فہرست طویل ہے۔ مولانا سید منت اللہ صاحب نے اس مضمون میں صرف ان کاموں کی نشان دہی کی ہے، جو سنہ ۱۹۳۴ء اور اس کے بعد صوبہ بہار کی مجلس قانون ساز اور بہاری نمائندوں کے انتخاب کے سلسلہ میں مولاناؒ کے ہاتھ انجام پائے۔ مضمون گو مختصر ہے، پھر بھی اس سے مولاناؒ کے "آئینی دماغ" اور اس کے "ثمرات" کا اجمالی اندازہ ہوجاتا ہے۔ 'م، ع']

سنہ ۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا۔ بہار سے تین مسلمانوں کی نشستیں تھیں، مولاناؒ نے امارت شرعیہ بورڈ کی طرف سے اس الکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ امارت کے تین اُمیدواروں میں دو تو بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ صرف ترہت کی نشست میں مقابلہ ہوا۔ امارت کے امیدوار جناب عبدالحمید خان صاحب تھے، اور ان کے مقابلہ میں جناب مولوی شفیع داؤدی صاحب تھے۔ ذاتی حیثیت سے اِن دو امیدواروں میں کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ ترہت میں مولوی شفیع داؤدی کے اثرات بہت تھے، اور اُن کے مقابلہ میں مولوی عبدالحمید خان صاحب کی کوئی شخصیت ہی نہ تھی۔ پھر بھی مولاناؒ کے تدبر نے

اس انتخاب کو بہت اہم بنا دیا۔ گرچہ امارت کو تقریبًا ایک سو ووٹ سے ناکامی ہوئی لیکن وہ نتیجہ تھا اپنی غلطیوں کا۔ کاش مولاناؒ کی ہدایتوں پر عمل کیا جاتا تو یہاں بھی کامیابی قدم چومتی ۔۔۔ اس انتخاب کے سلسلے میں مجھے بھی کام کرنے اور مولاناؒ کے ہمراہ دورہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس دوران میں انتخاب کے متعلق مولاناؒ کے خیالات معلوم کرنے کا موقع ملا۔ مولاناؒ انتخاب میں اپنے امیدوار کی کامیابی یا ناکامی کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتے تھے۔ مولانا علیہ الرحمۃ تمام کام کرنے والوں کو یہی سمجھایا کرتے کہ الیکشن میں اصل چیز امیدوار کی کامیابی نہیں بلکہ اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت ہے۔

۱۹۳۶ء ہی سے بہار میں مجلس قانون ساز کے عام انتخابات کی تیاریاں ہونے لگیں، مولانا علیہ الرحمۃ نے بھی "بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی" کی بنیاد ڈالی جس کا سیاسی نقطۂ نگاہ ہندوستان کی مکمل آزادی اور مذہبی نقطۂ نگاہ امارت شرعیہ کے فیصلوں کی پابندی تھا۔ پارٹی کے قیام کے دوران میں مولاناؒ سے تفصیلی گفتگو کے مواقع آئے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ مولاناؒ مسلمانوں اور ہندوستان کے تمام مسائل پر اسلامی نقطۂ نگاہ سے غور فرمایا کرتے ہیں۔ مولاناؒ کا ایمان تھا کہ اسلامی نظام حکومت و زندگی ہی بنی نوع انسان کے دینی اور دنیاوی فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ہر مسئلہ کو اسی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے اس لئے خواہاں تھے کہ اسلام، غلامی کا سب سے بڑا دشمن ہے وہ سرمایہ پرستی کے اس لئے مخالف اور کمزوروں اور غریبوں کے حامی تھے کہ اسلام کے

مقرر کردہ معاشی نظام کے ذریعہ غربت کو خوش حالی اور کمزوری کو قوت سے بدلا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں مولانا کا یہ نظریہ ہی ان کی بڑی خصوصیت تھی جس میں وہ شاید منفرد تھے۔

الیکشن میں حصہ لینے کے سوال پر مولانا علیہ الرحمۃ نے مجھ کو تبلایا کہ ہر قوم یا جماعت کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سیاسی اور آئینی طاقت حاصل کرے خصوصاً اس آئینی دور میں تو اس کے بغیر کسی سیاسی جماعت کا زندہ رہنا ہی مشکل ہے۔ مولانا علیہ الرحمۃ کا خیال تھا کہ مسلمانوں کا اصل مقصد تو ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام ہے اسلئے کہ موجودہ تمام طریق حکومت میں اسلامی حکومت ہی کا نظام مکمل ہے۔ لیکن چونکہ بحالات موجودہ براہ راست اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں مشکلات ہیں اس لئے سر دست کم از کم ایک ایسی مشترکہ حکومت کے قیام کی کوشش کیجائے جہاں مسلمانوں کے لئے مخصوص نظام ہو۔ مولانا کا خیال تھا کہ جس حکومت میں یہ بھی نہ ہو وہ آزاد حکومت نہیں کہی جا سکتی۔

مولانا علیہ الرحمۃ نے آزاد حکومت میں مسلمانوں کے مخصوص نظام کی جو تفصیلات پیش کی تھیں اُن کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ تو وہ ہے جس میں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں اور جو اسلامی حکومت کے اندر بلا امتیاز مذہب و ملت نافذ کئے جائیں گے۔ ان احکام کا تعلق جان، مال، عزت اور امن عامہ سے ہوگا۔

دوسرا حصہ وہ ہے جسے آجکل کی زبان میں "پرسنل لا" کہہ سکتے ہیں (موجودہ اصطلاح میں پرسنل لا کے معنی بہت محدود ہیں اور مولانا کے نظریہ پر حاوی نہیں) اس سے مراد وہ مسائل

ہیں جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے، اور جو اسلامی حکومت میں بھی صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص ہونگے۔ مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ ملکی آزادی کی جدوجہد میں ہمارا ایک مذہبی مقصد یہ بھی ہے کہ آزاد جمہوری حکومت میں مسلمانوں پر کم از کم اسلامی نظام حکومت کا وہ حصہ تو پوری طرح نافذ ہو سکے جس کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہے۔ چنانچہ انتخابات میں حصہ لینے سے مولاناؒ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ رفتہ رفتہ آئینی طریقہ پر مذکورہ بالا مقاصد کی طرف قدم بڑھایا جائے۔ اور مرکزی وصوبائی مجالس قانون ساز سے ایسے قوانین مرتب کرائے جائیں جو صحیح اسلامی اصول پر مرتب کیے گئے ہوں اور جن کا تعلق صرف مسلمانوں سے ہو۔ چنانچہ مولاناؒ نے اسی مخصوص نظریہ کے ساتھ بہار مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی قایم کی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو پارٹی کا منشور عام اور پارٹی کانفرنس کا خطبہ استقبالیہ)

پارٹی کے قیام کے بعد مولاناؒ کو سب سے زیادہ دشواریاں امیدواروں کے انتخاب میں ہوئیں۔ مولانا علیہ الرحمۃ کو ضرورت تھی ایسے امیدواروں کی جن کے دلوں میں ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کا جذبہ، مسلمانوں کا سچا درد اور مذہبی عقائد و احکام پر پورا اعتقاد ہو، ساتھ ہی ساتھ اتنا سرمایہ بھی ہو کہ انتخاب کے تمام اخراجات کو برداشت کر سکیں۔ ظاہر ہے یہ معیار کتنا دشوار تھا؟ ان مجبوریوں کے ساتھ پارٹی کے امیدواروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ میں اکثر مولانا علیہ الرحمۃ سے کہا کرتا کہ "آپ نے ایک گاڑی میں مختلف نسل کے گھوڑے لگا دیے ہیں، اب وہ گاڑی چلے گی کیونکر؟" مولاناؒ مجھے سمجھاتے اور فرماتے "اچھا، ان

اُمیدواروں کو علیحدہ کرکے، اُن لوگوں کے نام بتاؤ جو مناسب بھی ہوں، اور انتخابات میں مقابلہ بھی کر سکیں۔ —— میرے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا تھا، ظاہر ہے۔ لیکن دُنیا نے دیکھا کہ مولانا مرحوم نے اپنے غور و تدبر، بے پناہ قوتِ عمل اور زبردست شخصیت سے پارٹی کا شیرازہ بکھرنے نہ دیا، اور اُن سے وہ وہ کام کرائے، جو دوسرے کسی صوبہ میں نہ ہو سکے۔

جب انتخابات شروع ہوئے تو مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کا مقابلہ، بہار یونائیٹڈ پارٹی، بہار احرار پارٹی، کانگریس پارٹی اور آزاد اُمیدواروں سے ہوا۔

یونائیٹڈ پارٹی کے رُوحِ رواں مسٹر سید عبدالعزیز صاحب (بالقابہ) تھے۔ موصوف اُس وقت حکومتِ بہار کے وزیرِ تعلیم تھے، اس لئے یونائیٹڈ پارٹی کو حکومت کی تائید اور امداد حاصل تھی۔ خود وزیر موصوف نے اپنے نمائندوں کی کامیابی کے لئے دورے کئے، اور وہ سب کچھ کیا جو ممکن تھا۔ لیکن جب انتخاب کا نتیجہ منظرِ عام پر آیا تو دُنیا انگشت بدنداں رہ گئی —— ۳۲ اُمیدواروں میں صرف ۶ کامیاب —— شاید اسی پسپائی کا نتیجہ تھا کہ مسٹر سید عبدالعزیز پارٹی لیڈر ہونے کے باوجود اسمبلی سے مستعفی ہو گئے۔ گرچہ بعد میں پھر مسلم لیگ کے آغوش میں، انہوں نے پناہ لی۔

احرار پارٹی نے اپنی سرگرمی ترہٹ ڈویژن ہی تک محدود رکھی، کوئی دس بارہ اُمیدوار کھڑے کئے۔ اِس پارٹی کے رُوحِ رواں مولوی شفیع صاحب داؤدی تھے۔ مولوی صاحب موصوف ترہٹ میں کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ لیکن اِس انتخاب نے انہیں بھی چرکہ دیا۔ کسی نہ

کسی طرح تین امید وار تو کامیاب ہو گئے لیکن خود پارٹی لیڈر مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی ناکام رہے۔

کانگریس نے مسلم اُمیدواروں کے انتخاب سے پہلے مولاناؒ سے مصالحت کی گفتگو کی اور تجویز پیش کی کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی ۱۴ حلقوں میں اپنے اُمیدوار کھڑا نہ کرے، اور وہاں کانگریسی اُمیدوار کی مدد کرے۔ مولاناؒ اس تجویز پر راضی نہ ہوئے۔ آپ نے چند امیدواروں کے نام گنائے اور کہا ہم ان کی مدد صرف اس شرط پر کر سکتے ہیں کہ وہ اس بات کا عہد کریں کہ مجالس قانونساز میں تمام مذہبی معاملات میں امارت شرعیہ کے احکام کی پابندی کرینگے۔ چنانچہ انہی شرائط کے ساتھ سید شاہ محمد عمیر صاحب گیا، سعید الحق صاحب دربھنگہ، اور اور ڈاکٹر سید محمود صاحب سابق وزیر تعلیم کی حمایت کی گئی۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب کے لئے تو دو دو حلقے خالی کر دئے گئے۔ مولوی سعید الحق ابتداءً انڈیپنڈنٹ پارٹی کے امیدوار تھے لیکن بعد میں مولانا علیہ الرحمۃ کو معلوم ہوا کہ انہوں نے کانگریس کے عہد نامہ پر بھی دستخط کر دیا ہے۔ مولاناؒ نے خود سعید صاحب کو بلا کر تصدیق کی۔ تصدیق کے بعد آپ نے اس عہد نامہ کو جس پر امیدوار موصوف کے دستخط تھے چاک کر دیا۔ اور امارت شرعیہ کے عہد نامہ پر دستخط کرانے کے بعد ان کی تائید کی۔

کانگریس کے ایسے اُمیدواروں سے جنہوں نے امارت کے عہد نامہ پر دستخط نہ کئے، پارٹی کا مقابلہ بھی ہوا، جہاں بجز ایک کے، تمام امیدوار کامیاب رہے۔

مولاناؒ شرکت کانگریس کے حامی تھے اور تحریک سول نافرمانی وغیرہ کے زمانے میں کانگریس کے باضابطہ ممبر بھی بن جایا کرتے تھے۔ لیکن جہاں تک مجالس آئین ساز کا تعلق ہے مکمل سمجھوتہ کے بغیر کانگریس ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے وہ حامی نہیں تھے۔

مولاناؒ نے پارٹی کے ضوابط میں ایک طرف تو یہ دفعہ رکھی کہ مذہبی معاملات میں امارت شرعیہ کے فیصلہ کی پابندی کرنی ہوگی، اور دوسری طرف یہ کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ امیدوار امارت شرعیہ کے عہدنامہ پر دستخط کریں۔ مولاناؒ کا یہ طریق کار آئینہ دار ہے ان کی رجحان فکری کا، وہ چاہتے تھے کہ موجودہ طریق حکومت میں جس قدر قوانین اسلامی اصول کے ماتحت بن سکتے ہوں ان میں زیادہ سے زیادہ مسلمان ممبروں کی تائید حاصل کی جاسکے۔

بہرحال، انتخابات ہوئے اور نتیجہ نے یہ بتایا کہ انڈپینڈنٹ پارٹی کو تقریباً ۸۰ فی صدی کامیابی ہوئی۔

انتخاب کے نتائج ظاہر ہونے کے بعد انڈپینڈنٹ پارٹی اور اس کے کامیاب ممبروں کا ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اُس جلسہ میں مولاناؒ نے جو تقریر کی وہ اُن کے مخصوص تدبر و فراست کی حامل تھی، آپ نے اپنے نظریہ کے مطابق ہندوستان کی آنے والی حکومت کے اصول بتائے، اور ممبروں کو اُن کا طریق کار۔

مولاناؒ نے اُس وقت اپنے تمام ممبروں کو ۲ دو مشورے دیئے۔ ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی، اندرونی مشورہ یہ تھا کہ ہر ممبر کسی ایک خاص شعبہ کا ذمہ دار ہو۔ وہ اس شعبہ کے

تمام معلومات حاصل کرے اور اس پر پوری طرح تیار ہو۔ بیرونی کام یہ تھا کہ کوئی ممبر اپنے حلقۂ انتخاب سے غافل نہ ہو۔ وہ اپنے حلقہ میں یا خود کام کرے یا اس کے اخراجات برداشت کرے۔ افسوس ہے کہ پارٹی کے ممبران مولانا کے ان مفید مشوروں پر کاربند نہ ہو سکے، ورنہ آج اسمبلی کے اندر پارٹی کا مقام بہت بلند ہوتا۔

اسی جلسہ میں مولانا کی مرتب کی ہوئی ایک تجویز بھی منظور ہوئی تھی جس میں اپنے مقاصد کو برقرار رکھتے ہوئے کانگریس کے ساتھ اشتراکِ عمل کا اعلان کیا گیا تھا لیکن کانگریس نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی۔ غالباً اس وقت کانگریس کا نظریہ اکثریت والے صوبوں میں خالصًا پارٹی گورنمنٹ قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اس کی مخالفت میں پنڈت جواہر لال جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے اور مولانا ابو الکلام آزاد نے بیانات شائع کئے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک کہا کہ ایک شاگرد دو مختلف اُستادوں کو کیونکر خوش رکھ سکتا ہے؟

اس مسئلے میں مولانا مشترکہ وزارت کے قیام کے حامی تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے اس خیال کو ایک مشہور رہنما کے سامنے پیش کیا۔ مولانا نے فرمایا "نظری اور عملی سیاست کے فرق کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔ مختلف ملکوں کی پارلیمنٹری تاریخ کو دیکھیے۔ مختلف الخیال جماعتیں ایک متحدہ اسکیم بنا کر مشترکہ وزارتیں مرتب کرتی ہیں اور کامیابی کے ساتھ چلاتی ہیں؛

ہاں! ایسے مسائل بھی پیش آجاتے ہیں جن پر اتفاق نہیں ہوتا۔ تو پھر وزارتیں ٹوٹ جاتی ہیں اور اُن کی جگہ نئی بنتی ہیں"۔ مولاناؒ نے یہ بھی فرمایا کہ "آج تو کانگریس گریز کرتی ہے لیکن اگر کانگریس کو موقع ملا تو وہ اقلیت والے صوبوں میں مشترکہ وزارتیں ضرور مرتب کریگی"۔ چنانچہ ہم نے مولاناؒ کی زندگی ہی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سرحد اور آسام میں مولاناؒ کا خیال حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔ خود یہاں کی صوبائی کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ذمہ دار اراکین نے ۱۹۳۹ء میں مولاناؒ کے سامنے انڈیپنڈنٹ پارٹی کی شرکت سے وزارت مرتب کرنے کی تجویز پیش کی۔ جسے مولاناؒ نے بعض وجوہ کی بناپر قبول نہ فرمایا۔۔۔ یہی ہے "عملی و نظری سیاسیات" کا فرق!

مارچ ۱۹۳۷ء میں وزارت قبول کرنے کا سوال سامنے آیا۔ میں قبول وزارت کا مخالف تھا، اور مولاناؒ اس کے حامی۔ میں نے اپنی رائے مولاناؒ کے سامنے عرض کردی اس پر کئی دنوں تک باتیں ہوتی رہیں۔ میں بھی اپنی پورے علم و واقفیت کے مطابق بحث کرتا رہا۔ شاید کسی اور موقع پر میں نے مولاناؒ کا اتنا وقت ضائع نہ کیا ہوگا۔ مولاناؒ مجھے پوری شفقت کے ساتھ برابر سمجھاتے رہے۔

صورت حال یہ تھی کہ کانگریس نے ۱۹۳۷ء سے پہلے اپنے اجلاسوں میں اور ورکنگ کمیٹی نے اپنی تجویزوں میں صاف اعلان کردیا تھا کہ دستور جدید ناقص اور قابل استرداد ہے، لیکن کانگریس نے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل کرتے ہی یہ اعلان کیا کہ اگر گورنر اپنے

اختیارات خصوصی کو استعمال نہ کرنے کا یقین دلادیں تو کانگریس وزارت مرتب کرنے کے لئے تیار ہے۔

مولانا کا خیال تھا کہ کانگریس کی یہ شرط صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اگر گورنر کانگریس کی شرط تسلیم کر لیتے ہیں تو یہ قانون قابل عمل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ کانگریس کے نقطۂ نگاہ سے یہ قانون قطعی ناقابل عمل تھا۔ اس قانون سے کانگریس کا جو سب سے بڑا اصولی اختلاف تھا وہ گورنر کی مداخلت یا عدم مداخلت کا نہ تھا وہ یہ تھا کہ قانون بنانے کا حق ہندوستان کے بسنے والوں کو حاصل تھا نہ کہ برطانوی پارلیمنٹ کو، اس لئے بہر حال وہ قانون قابل استرداد ہی تھا۔

مولانا کے خیال میں ایسی انقلابی جماعتوں کے لئے جو کانسلوں میں قانون مسترد کرانے کی غرض سے پہنچی ہوں، دو ہی عملی صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ اس قانون کے خلاف غیر آئینی جدوجہد شروع کر دی جائے، اور دوسری یہ کہ وزارت مرتب کر کے عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جائے اور اس طرح اس قانون کے مسترد کرنے کا سامان فراہم کیا جائے۔

چنانچہ انہی خیالات کی بنا پر مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی نے وزارت قبول کی۔ لیکن وزارت قبول کرنے کے وقت ہی پارٹی نے ایک تجویز کے ذریعہ یہ بات صاف کر دی کہ اصولی طور پر اس صوبہ میں وزارت کانگریس کو مرتب کرنی چاہیئے تھی لیکن چونکہ کانگریس اور گورنر کی جنگ ہے

اور فی الحال کانگریس کوئی جدوجہد بھی نہیں کرتی ہے، اس لیئے یہ پارٹی اس صوبہ میں وزارت بنا کر اور عوام کی خدمت کر کے قانون کو آئینی طور پر مسترد کرانے کے مواد فراہم کریگی، ساتھ ہی ساتھ پارٹی کی دلی خواہش ہے کہ کانگریس اور گورنر کے درمیان سمجھوتہ ہو جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انڈیپنڈنٹ پارٹی کی وزارت نے بعض ایسے کام کیئے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں اس کی پہلی خدمت سرکاری دفاتر میں اردو زبان کا اجرا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں مولانا کی کن کن کوششوں کو دخل تھا۔ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اگر مولانا مرحوم اس کے لئے کوشاں نہ ہوتے تو آج بھی یہاں اردو کے ساتھ اچھوت ہی جیسا سلوک ہوتا۔

پارٹی کی دوسری اہم ترین خدمت جس سے صوبہ کے تمام کسان آج تک مستفید ہو رہے ہیں وہ دفعہ ۱۱۲ کی ترمیم ہے۔ جس سے کسانوں کو کئی طرح پر تخفیف لگان کا فائدہ پہنچا۔ آج کانگریسی حضرات کسانوں کی بھلائی اور فلاح وبہبود کا دم بھرتے پھرتے ہیں۔ لیکن، حقیقتاً یہ کارنامہ ہے انڈیپنڈنٹ پارٹی کا۔ اور یہ سب کچھ مولانا مرحوم ہی کے اشارہ پر ہوا تھا۔ کانگریس کے قبول وزارت کے بعد ہم لوگوں کو مولانا کے اِس عقیدہ کی صحت کا کافی ثبوت ملا کہ مکمل سمجھوتہ کے بغیر مسلمانوں کو کانگریس ٹکٹ پر اسمبلی نہ جانا چاہیئے۔

ایک مثال ملاحظہ ہو:۔ نمائندہ اسمبلی والی تجویز جب پیش ہوتی تو مولانا کے حکم سے پارٹی کی طرف سے دو ترمیمیں پیش کی گئیں (۱) نمائندہ اسمبلی کے نمائندے جداگانہ مذہبی حلقوں

سے منتخب ہوں۔ (۲) نمائندہ اسمبلی میں کثرت رائے پر فیصلہ نہ ہو، بلکہ باہمی رضامندی شرط قرار دی جائے۔ ان ترمیموں کی معقولیت ظاہر ہے۔ لیکن پھر بھی ان ترمیموں پر کئی دنوں تک مباحثے ہوتے رہے۔

وزیر اعظم نے اپنی جوابی تقریر میں اور ایوان سے باہر وزیر مالیات نے ہمیں بتایا کہ یہ تجویز کانگریس ورکنگ کمیٹی کی منظور شدہ ہے اس لئے کسی ترمیم کی گنجایش نہیں۔

میں نے مولاناؒ سے ساری روئداد کہی اور اپنی ذاتی رائے ترمیمیں واپس لے لینے کے حق میں دی۔ لیکن مولاناؒ کو ان ترمیموں پر برابر اصرار رہا اور وہ یہ کہتے رہے کہ یہ سارے بہانے ہیں ورنہ اگر وزیر اعظم چاہیں تو ابھی چند منٹوں کے اندر صدر کانگریس سے فون پر طے کر سکتے ہیں۔ مولاناؒ کے اس مضبوط رویہ نے بالآخر وزیر اعظم کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ فون پر صدر کانگریس سے مشورہ کریں، چنانچہ صدر کانگریس پنڈت جواہر لال کی مرضی سے یہ ترمیمیں بہار اسمبلی میں منظور ہو گئیں۔

یہ تجویز تمام کانگریسی صوبوں میں پیش کی گئی۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ بہار کے علاوہ تمام صوبوں میں یہ تجویز من و عن منظور ہو گئی۔ صرف سندھ کے ہندو ممبران اپنے نقطۂ نگاہ سے ایک ترمیم منظور کرا سکے۔

مولاناؒ کے قانونی نکتہ سنجی کی ایک اور مثال پیش ہے:۔

بہار اسمبلی میں کانگریس کی طرف سے زرعتی آمدنی پر ٹیکس کا مسودۂ قانون پیش ہوا۔ مولاناؒ کو

شبہ ہوا کہ کہیں اِس قانون کی تحت میں اوقاف بھی نہ آجائیں۔ چنانچہ انہوں نے پورا مسودہ پڑھوا کر سنا۔ سننے پر مولانا کا خدشہ صحیح نکلا۔ ابتدا مولانا کی یہ کوشش رہی کہ ارباب حکومت سے مل کر اس مسئلہ کو باہمی طور پر طے کرلیا جائے۔ لیکن جب وہ اس پر راضی نظر نہ آئے تو مولانا کو اخبارات میں بیانات اور پھر سول نافرمانی کی دھمکی دینا پڑی۔ اِسی دوران میں مولانا ابوالکلام مدظلہٗ مسئلہ کو سلجھانے کے لئے پٹنہ تشریف لائے اور اُن کے مشورہ سے حکومت بہار نے ہم لوگوں کی ترمیم منظور کرلی اور زرعتی آمدنی پر ٹیکس کا قانون اوقاف پر عائد نہ ہوسکا۔

انکم ٹیکس کے قانون میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد مولانا نے پارٹی کی طرف سے مسلم وقف بل، لوکل باڈیز (ڈسٹرکٹ بورڈوں سے متعلق) بل اور میونسپلٹی کا ترمیمی مسودہ قانون مرتب کیا۔

جب حکومت کو اِن مسودوں کی اطلاع ملی تو خود اس نے اپنے طور پر مسلم وقف بل اور میونسپلٹی کا ترمیمی بل پیش کیا۔ سب سے پہلے مسلم وقف بل سامنے آیا۔ مجوزہ بل نہایت ناقص تھا، چنانچہ اس پر غور کرنے کے لئے ایک منتخبہ کمیٹی بنی۔ کمیٹی نے اپنے جلسوں میں مولانا کو بھی طلب کیا اور ان کی رائے سے بجز دو چار مقامات کے ہر جگہ اتفاق کیا۔ چنانچہ رائے شماری کے وقت پارٹی نے مجموعی طور پر بل کی حمایت کی البتہ ان مقامات پر جہاں اتفاق نہ ہوسکا تھا، مخالفت کی۔ پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ صوبہ بہار کا وقف بل ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے وقف بلوں سے کئی درجہ بہتر ہے۔

ایک دفعہ اس منتخبہ کمیٹی میں ایک اصول مقرر ہوا۔ الفاظ پٹنہ ہائیکورٹ کے مشہور وکیل مولوی حسن جان صاحب کے تھے۔ لیکن ایڈووکیٹ جنرل نے اس پر قانونی حیثیت سے اعتراض کیا۔ پھر اسی اصول کی ترتیب مسٹر محمد یونس بیرسٹر پٹنہ نے کی ایڈووکیٹ جنرل نے قانونی مجبوریوں کی بنا پر اُسے بھی نامنظور کیا۔ آخر میں مولاناؒ نے اسے خود مرتب کیا۔ اُردو داں ہونے کے سبب سے ایڈوکیٹ جنرل نے اسے خود اور بلا تامل منظور کر لیا۔ [۱]

اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک غیر سرکاری مسودۂ قانون جہیز بل (ڈاوری بل) کے نام سے پیش ہوا۔ مولاناؒ کی دُور بین نگاہوں نے اس کے مُضر اثرات کا فوراً اندازہ کر لیا۔ اور یہ مولاناؒ ہی کی محنتوں کا نتیجہ تھا کہ اس بل سے مسلمان بری کر دیے گئے۔

مولاناؒ کا عقیدہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کی دُو جداگانہ معاشرتیں ہیں اس لیے ان کی اصلاح بھی جداگانہ قوانین کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ مولاناؒ اس بات کے برابر کوشاں رہے کہ یہ اصول اسمبلی میں رواج پا جائے۔ مولاناؒ کا یہ بھی خیال تھا کہ اصولاً ایک فرقہ کے معاشرتی قانون میں دوسرے فرقہ کے رکن کو ووٹ دینے کا بھی حق نہ ہونا چاہیے۔

غرض یہ کہ صوبجاتی اور مرکزی اسمبلی میں حج بل، بیعلم بل اور مسودۂ قانون انفساخ نکاح

---

[۱] جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بالمقابہ کے مضمون میں بھی اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ 'م ع'

وغیرہ کے سلسلہ میں جو خدمات مولاناؒ نے انجام دی ہیں، ان کی داد کوئی ماہر قانون ہی دے سکتا ہے۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ، ان کی تفصیلات کو قلمبند کر لیتا، تو اسلامی قانون کی ایک بڑی خدمت ہو جاتی۔

افسوس! مولاناؒ اس ناپاک دنیا کو چھوڑ کر اُس عالم کو سدھارے جہاں کی زندگی، ابدی اور سرمدی ہے، اور کم سے کم اس صوبہ کی مذہبی اور سیاسی زندگی، اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اِس قحط الرجال کے زمانہ میں، مولاناؒ کے ایسے سرپرست کا اُٹھ جانا مسلمانوں کی شومیِ قسمت کا آخری نشان ہے، اب کون ہے جو مسلمانوں کی ہر تکلیف پر بے چین ہو، ان کی ہر صدا پر لبیک کہے، اور اُن کے ہر آڑے وقت پر کام آوے؟

حقیقت یہ ہے کہ جانے والا، بقول مولانا مناظر احسن گیلانی، مسلم قوم کے سرِ مزار کا آخری چراغ تھا۔ حق جل مجدہٗ اپنے سچے خادم پر ہمیشہ رحمتوں کی بارش برسائے، اور ہم لوگوں کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

نقصانِ عظیم!

(از مولوی سیّد احمد صاحب عروج قادری امجدی)

یہ کیا حالت ہے میری آج میرا دل دھڑکتا ہے
یہ کیوں رہ رہ کے سینے میں اک انگارہ بھڑکتا ہے

مجھے کیوں آج نظمِ علم و دیں برہم نظر آیا
یہ کیوں ہر دیدۂ حق آشنا پُر نم نظر آیا

صفِ مردانِ آزادی پہ حسرت چھائی جاتی ہے
ہوا کیا ہے وطن میں مُردنی سی پائی جاتی ہے

زمیں تا آسماں مجھ کو عجب حالت نظر آئی
تحیر تھا کہ اتنے میں یہ جاں فرسا خبر آئی

کہ مردِ حریت سجاد نے اذنِ سفر پایا
سفر وہ جس سے کوئی آج تک واپس نہیں آیا

سیاست دم بخود صدق و صفا محوِ تحیرانی
تدبر سر بزانو روئے مذہب پر پریشانی

عمل کی آنکھ روئی علم کے دل سے فغاں نکلی
تفقہ کے لبوں سے آہ بے تاب و تواں نکلی

وہ ملّت کا عضو کامل فردِ شمع ملت بجھا
نڈر بے باک سرتاپا مجاہد تھا مجاہد تھا

مجاہد جس نے ساری زندگی آرام تج ڈالا
مصیبت مول لے لی اور وقار و نام تج ڈالا

ارادے کا دھنی پیری میں بھی جوشِ جوانانہ
سراپا علم سرتاپا عمل جانباز و فرزانہ

مجاہد جس کے نعروں سے لرز اٹھی زمینِ ہند
مجاہد جس کے سجدوں سے چمک اٹھی جبینِ ہند

مجاہد وہ جو فاقوں سے نہ شرمایا نہ گھبرایا
جبینِ صاف پر جس کی مصائب میں نہ بل آیا

مجاہد جس کے عزم آہنی پر آسماں حیراں
فرشتے دم بخود، جبریل چپ، کون و مکاں حیراں

حکومت عزم سے جس کے ہزاروں بار ٹکرائی
ہوئی ہر بار رسوائی، ہوئی ہر بار پسپائی

وہ عالم جس کی تحریروں میں حکمت پرورش پاتی
صداقت پرورش پاتی شجاعت پرورش پاتی

امارت کا مربی اور جمعیۃ اس کے ہاتھوں میں
شریعت اس کے ہاتھوں میں سیاست اسکے ہاتھوں میں

تدبر، نکتہ دانی ختم تھی جس ذات عالی پر
نظر جاتی نہیں ندوہ سے اُس جائے خالی پر

جگر سے ہوک اٹھتی ہے سمجھ میں کچھ نہیں آتا
کلیجہ پھٹ رہا ہے غم سے کچھ لکھا نہیں جاتا

الٰہی ان کی قبر پاک پر رحمت کی بارش ہو
تلطف کی نظر ہو اور عنایت کی تراوش ہو

الہلال بک ایجنسی کی دوسری کتاب

حکومت الٰہی

(زیر طبع)

تصنیف حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ

مفکر جلیل، حضرت مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ کی آخری تصنیف جس میں حکومت الٰہی کی ماہیت اور ضرورت سے بحث کی گئی ہے، دنیا کے تمام اجتماعی نظاموں سے مقابلہ کرکے اسلامی جماعتی نظام کی برتری پر زور دیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ کن اسباب کے ماتحت انسانوں کے بنائے ہوئے حکومت کے نظام ناکام رہے ہیں اور ہمیشہ ناکام رہیں گے۔

ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

انسانیت کی نجات قانون الٰہی پر عمل کرنے اور حکومت الٰہی کے نافذ کرنے میں ہے

اپنے موضوع پر پہلی اور اچھوتی کتاب، پڑھیے اور معلومات میں اضافہ کیجیے۔

الہلال بک ایجنسی، بانکی پور، پٹنہ